جامعہ

۱۹۶۵

جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی

جامعہ

سالانہ چندہ | قیمت فی پرچہ
چھ روپے | پچاس پیسے

جلد ۶۲	بابت ماہ جولائی ۱۹۷۰ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

ایڈیٹر: ۷۴۲۵۸

مینجر: ۷۴۴۷۰

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی

مطبوعہ: یونین پریس دہلی

ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

اِدھر کچھ عرصہ سے عربی مدرسوں، خاص طور سے بڑے عربی مدرسوں میں جو دارالعلوم ہونے کا مرتبہ رکھتے ہیں، طالب علموں کی اسٹرائک کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، ان اسٹرائکوں میں کبھی کبھی طلباء تشدد کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، ایسی نازیبا حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے ملت کے اخلاقی انحطاط کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ دو ایک دارالعلوموں میں تو صورت حال ایسی ہوگئی کہ ارباب اہتمام کو پولیس بلانی پڑی، غیر معینہ مدت کے لئے دارالعلوم بند کر دیئے گئے اور طلباء سے ہوسٹل اور مدرسہ کے احاطے خالی کرالئے گئے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے اخلاق و شائستگی کے اصولوں کو صدمہ پہونچا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ قدروں کا پرانا اور روایتی ڈھانچا منتشر ہو کر رہ گیا ہے، اور ہمارے دینی حلقوں میں بھی مذہبی قدروں کی وہ قدر نہیں رہی جس سے ان حلقوں کا بھرم قائم تھا۔

عربی مدرسوں میں شاگرد اور استاد کے رشتے نے ایک طرح کے تقدس کی شکل اختیار کرلی تھی، اور صدیوں سے یہی صورت چلی آتی تھی، طالب علم اپنے استاد کی عزت کرتے تھے، ان سے محبت کرتے تھے، ان کی خدمت کو سعادت تصور کرتے تھے، سمجھتے تھے کہ یہ شخصیت خود علم کا ایک سرچشمہ ہے اور اس سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے۔ استاد طالب علموں کا مربی ہوتا تھا، ان کے دکھ درد میں شریک اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہمہ وقت متفکر، ہم نے ایسے استاد دیکھے ہیں جو طالب علموں کی خدمت ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے اور یہ دیکھتے رہتے تھے کہ اس فریضہ کی بجا آوری میں کوتاہی نہ ہو۔ اس طرح مدرسوں کی فضا خدمت اور محبت کی فضا تھی، اس کے سکون میں کبھی ارتعاش پیدا ہوتا تو ذمہ دار اساتذہ و طلباء

جن میں باہم خاندان کے افراد جیسا قرب ہوتا، حالات کو سنبھال لیتے تھے۔ لیکن اب یہ صورت عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہے، کیوں اساتذہ و ارباب اہتمام اور طالب علم ذرا سی دیر میں ایک دوسرے کے فریق اور حریف بن جاتے ہیں اور وہ سب کچھ دیکھنے میں آرہا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا؟

ہمارے خیال میں ان سوالوں پر غور کرنے اور کسی مثبت نتیجے پر پہنچنے کی ذمہ داری نوجوان طالب علموں پر اتنی نہیں جتنی کہ عربی مدرسوں کے استادوں اور اہتمام کے لوگوں کی ہے۔ آج کا ہر نوجوان خواہ وہ جدید تعلیم کے اداروں کا طالب علم ہو خواہ قدیم تعلیم کے اداروں کا، یا وہ کہیں نہ پڑھتا ہو، اپنا وقت مزدوری پر گذارتا ہو یا کسی شعبہ میں کام کرتا ہو، بیزار ہے اپنے حالات سے، اپنی سماج سے، اپنی پوری زندگی سے۔ اس بیزاری میں تلخی ہے، بے چینی ہے، جھنجلاہٹ ہے، وہ کیا چاہتا ہے اسے خود نہیں معلوم، ہاں، وہ جن حالات میں ہے اُن پر قانع نہیں رہنا چاہتا، کوئی تبدیلی چاہتا ہے، یہ تبدیلی کیوں ہو اور کیسی ہو، عام طور پر اُسے اس کا کوئی شعور نہیں۔ عربی مدرسوں کے طالب علموں کی بڑی تعداد جس طبقہ سے تعلق رکھتی ہے وہ معاشی، معاشرتی اور ذہنی اعتبار سے پچھڑا ہوا طبقہ ہے، یہ طبقہ اور اِس سے تعلق رکھنے والے یہ طالب علم اپنے گرد و پیش زندگی کے معیار کو اونچا ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بجا طور پر اس کے آرزومند ہوتے ہیں کہ اُن کے بھی معاشی و معاشرتی حالات بہتر ہوں اور بدلتی ہوئی زندگی میں ان کا بھی اعتبار قائم ہو، لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جس طرح کی تعلیم وہ حاصل کر رہے ہیں اُس سے اُن کے معیارِ زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، ہاں قناعت اور دین کی خدمت وہ قدریں ہیں کہ انھیں مادی سود و زیاں سے منہ موڑ کر دین کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے، اور پھر فارغ ہونے کے بعد دین کے کام میں لگ جانا چاہئے، لیکن وہ کیا کریں جب وہ دیکھتے ہیں کہ عیسائی مبلغین اپنے دین کی خدمت بہتر طور پر کر رہے ہیں اور ان کی زندگی کا معیار بھی اونچا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے پاس اتنے ذرائع ہیں کہ اگر انھیں سلیقے اور دیانتداری کے ساتھ ایک نظام کے تحت استعمال میں لایا جائے تو کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے ہمارے عربی مدارس دین کی خدمت بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ اسی لئے یہ بات بھی کہی جاتی رہی ہے کہ عربی مدرسوں کے

نصاب تعلیم میں بھی وقت کی ضرورت کے مطابق تبدیلی ہونی چاہیے طریقۂ تعلیم بھی بدلنا چاہیے اور تربیت کے اصولوں پر بھی نظر ثانی کرنی چاہیے

عربی مدرسوں کے نصاب تعلیم، طریقۂ تعلیم اور تربیت کے اصولوں کی کمزوری کا اندازہ صرف ایک مثال سے کیا جاسکتا ہے، ہم نے عربی مدرسوں اور دارالعلوموں سے نکلے ہوئے ایسے سیکڑوں طالب علم دیکھے ہیں جو ایسے بدلے کہ اپنے فکر وعمل سے کسی طرح یہ ثابت نہیں کرسکتے تھے کہ کبھی انھوں نے عربی مدرسے میں پڑھا ہے، حالانکہ اُن میں سے تقریباً سبھی خالص دینی ماحول میں تقریباً سات آٹھ برس گذار کر آئے تھے، نیا ماحول پاتے ہی تھوڑی ہی مدت میں انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح بدل لیا کہ پرانی تربیت کا کوئی اثر اُن سے ظاہر نہ ہوتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قید خانے میں مقید تھے اب جو آزاد ہوئے ہیں تو اسیری کا ہر نقش مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج سے تیس چالیس سال پہلے ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا تھا۔ اب شاید تربیت کے وہ پُرانے اصول بھی ان مدرسوں میں نہیں برتے جاتے۔ تعلیم کا جو نصاب رائج ہے اور جس طریقہ سے تعلیم دی جاتی ہے اس سے زیادہ تر طالب علموں کو دین کی صحیح تعلیم اور علوم اسلامیہ کی کافی معلومات حاصل نہیں ہو پاتیں، ہمارے علماء کو اس اہم مسئلہ کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیے، نصاب تعلیم کو دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے مفید بنانا چاہیے، طریقۂ تعلیم ایسا ہو کہ طالب علموں میں غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہو، اور تربیت اس ڈھنگ سے کی جائے کہ مزاج میں پختگی، اعلیٰ اخلاقی قدروں سے محبت اور دین کی خدمت کا سچا جذبہ پیدا ہو۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ نوجوانوں کی تربیت کے لئے استادوں کو اپنی زندگی میں بڑی تبدیلی کرنا ہوگی، انھیں اخلاق، ایثار، نفس کشی، محنت اور دیانتداری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا چاہیے، اگر وہ قناعت کی تعلیم دیں تو خود قناعت پسند ہوں، اگر توکل کی بات کریں تو اپنی زندگی سے ثابت کریں کہ کہ وہ خود اس پر ایمان رکھتے ہیں، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت عربی مدرسوں میں استادوں کا جو حال ہے اُس کا بہت خراب اثر طالب علموں پر پڑ رہا ہے، بلاشبہ ان مدرسوں میں اچھے اساتذہ بھی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے اور روز بروز کم ہوتی جارہی ہے، ان مدرسوں میں بھی

سیاست" کا وہی انداز ہے جو آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پایا جاتا ہے، گروپ بندی، ایک دوسرے کی برائی، اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ، اپنے مفاد کے لئے طالب علموں کو استعمال کرنا، طالب علموں کے سامنے اپنے ساتھیوں کی غیبت، رشد وہدایت کے نام پر طویل اسفار، تبلیغ کو بہانہ بنا کر اسباق سے بچنے کا رجحان ـــــ یہ اور اس طرح کی دوسری خرابیاں بڑھتی جا رہی ہیں، ظاہر ہے کہ ان باتوں کا اثر طالب علموں پر پڑتا ہے اور یہ سب خرابیاں ان میں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ طالب علم جو پہلے ہی سے اپنے حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس ہیں، معمولی سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں اور مدرسوں کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔

عربی مدرسوں کے ارباب اہتمام کی اپنی الگ سیاست ہو گئی ہے اور وہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اساتذہ کی گروپ بندیوں کو مفید سمجھتے ہیں، حالانکہ اُن کا کام یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ ایسے عناصر کی حوصلہ شکنی کرتے، اچھے اساتذہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور روز بروز گرتے ہوئے معیار تعلیم وتربیت کو سنبھالتے، مدرسے کے انتظام وانصرام میں اساتذہ وطلباء کو شریک کرتے اور ادارہ کو چلانے کی ذمہ داری انھیں پر ڈالتے، یعنی مدرسے کا ماحول جمہوری ہوتا، آمرانہ نہ ہوتا۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ طالب علم، استاد اور اہتمام کے افراد، کوئی بھی سوچنے سمجھنے اور دوسرے کی سننے کے لئے تیار نہیں، کس سے کہئے اور کیا کہئے! پوری ملت پر ایک ہمہ گیر انحطاط ہے جو ادبار بن کر چھایا ہوا ہے، ہمارے جدید تعلیم کے ادارے تو زبوں حالی کا شکار تھے ہی، اب عربی مدرسے اور دارالعلوم بھی جو کبھی دین کے قلعے تھے، اخلاقی اور تعلیمی لحاظ سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

ڈاکٹر سلامت اللہ

ڈاکٹر ذاکر حسین ــــ افکار و نظریات

(یہ مضمون جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اُس جلسے میں پڑھا
گیا جو ذاکر صاحب مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر
بتاریخ ۳ مئی ۱۹۷۰ء منعقد ہوا ــــــــ)

جناب صدر، ڈاکٹر وی، کے، آر، وی، راؤ، خواتین و حضرات،

ذاکر صاحب کو ہم سے جدا ہوئے ایک سال بیت گیا مگر ہمیں یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم لوگ جنھیں ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع ملا، ان کی ذات اور صفات سے اس قدر متاثر ہیں کہ اب جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کا جائزہ لینا بڑا کٹھن کام ہے، پھر جو شخصیت اتنی ہمہ گیر اور پہلودار ہو اس کا نقش کھینچنا اور بھی مشکل بات ہے، اس کے علاوہ موقع اور وقت اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی طویل مضمون پیش کیا جائے۔

ہندوستان میں اپنے دور کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سبھی اہم پہلوؤں کا ذاکر صاحب نے بغور مشاہدہ کیا اور اپنے علم اور مطالعے کی روشنی میں ان سے متعلق نظریات قائم کیے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں، ان نظریات کی آئینہ دار ہیں۔ یہاں ہم صرف دو چیزوں سے بحث کریں گے ایک تو یہ کہ ذاکر صاحب کے نزدیک قومیت اور قومی تعلیم کا تصور کیا

تھا اور دوسرے یہ کہ وہ فرد اور جماعت کے باہمی رشتے کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور وہ کس قسم کا سماج قائم کرنا چاہتے تھے، در اصل یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

موضوع کی حدبندی کرنے کے بعد بھی یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ مضمون کو کیسے شروع کیا جائے۔ غالباً اس معاملے میں اس سے مدد ملے گی کہ اگر ذاکر صاحب آج زندہ ہوتے تو ملک کے موجودہ حالات سے ان کے دل و دماغ پر کیا کیفیت طاری ہوتی، پچھلے ایک سال کی مدت میں ملک کو نہایت شرم ناک فرقہ وارانہ حادثات سے دوچار ہونا پڑا ہے، درندگی اور بہیمیت کے اعتبار سے یہ بھی کم و بیش اسی درجے کے ہیں جو ملک کے بٹوارے سے پہلے رونما ہوئے تھے۔ ان واقعات سے ایک بار پھر ہمارے کانوں میں ذاکر صاحب کے وہ الفاظ گونجنے لگے ہیں جو انھوں نے جامعہ کی سلور جبلی کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے:

"آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے، حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ ..... ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے، جب ہم یہ سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں .... خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے، یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے، یہ مسئلہ اس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا

کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھدنے نہ دیجئے۔"

کتنا گہرا درد اور شدید کرب ہے ان الفاظ میں ! آج کا ہندوستان ۱۹۴۶ء کے ہندستان سے مختلف ہے، ملک کے دو حصے ہو چکے ہیں اور دونوں حصے اپنی اپنی جگہ آزاد اور خود مختار ہیں۔ لیکن قوم کے لیڈروں سے ان الفاظ میں جو اپیل کی گئی ہے اس کی معنویت کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ اور آج روئے سخن چند چوٹی کے نیتاؤں کی طرف نہیں بلکہ دیس میں بسنے والے سب کے سب مخاطب ہیں۔ اس آواز میں ایک پیغام عمل پوشیدہ ہے جو ہم سب کو جد وجہد کی دعوت دیتا ہے۔

ہندوستان کی متحدہ قومیت کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہیں۔ مذہب، ذات پات، تہذیب، زبان اور علاقے کی بنا پر شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ قومی یک جہتی اور ہم آہنگی قائم کرنے کی کوششوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۹۳۵ء میں فرمایا تھا:

"مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔"

اسی خطبے میں ذاکر صاحب نے قومی تعلیم کے مسئلے کا بھی ذکر کیا ہے اور تعلیم کے سماجی اور تہذیبی تصور کی روشنی میں اس گتھی کے حل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے، مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے

کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علاحدہ علاحدہ ہیں، قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں ان تفریقوں کو بالکل پس پشت ڈال دیں یا ہر صوبے اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے۔ اگر آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانشمندی کا تقاضا ہی نہ سمجھا جائے گا بلکہ خود صحیح تعلیم کے لیے لازمی مانا جائے گا۔"

در اصل قومی یک جہتی اور قومی تعلیم کا یہ تصور اُس تصور سے بالکل مختلف ہے جو بعض قومی یک جہتی کے نام لیوا "بھارتی کرن" کے نعرے میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اکثریت کی تہذیب ہی فقط ہندوستانی تہذیب کہلانے کی مستحق ہے۔ اس لئے اُسی کو تمام لوگوں پر مسلط کر کے قومی یک جہتی کی ضمانت کی جا سکتی ہے۔ یہ گروہ کثرت میں وحدت تلاش کرنے کا قائل نہیں اور اسی وجہ سے اُسے وحدت میں کثرت گوارا نہیں۔

ذاکر صاحب کا قومی تعلیم سے متعلق یہ خیال تعلیم کے اُس تصور سے ہم آہنگ ہے جو انھوں نے متعدد بار مختلف موقعوں پر واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"سماج کی تمام مادّی اور غیر مادّی چیزیں سب ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اپنے کو ان چیزوں سے ظاہر کرتا ہے، یا یوں کہئے کہ ذہن اپنے کو اپنے سے باہر یہ شکلیں دیتا ہے۔ ان چیزوں میں اس شخصیت کے ذہن کا اثر بھی ہوتا ہے جس نے انھیں بنایا، اس قوم یا نسل کا اثر بھی ہوتا ہے جن میں اس نے یہ چیزیں بنائی تھیں۔

ان سب کا اثر یوں کہیے کہ ان چیزوں میں آکر چھپ رہتا ہے، سوجاتا ہے، کوئی نیا ذہن
جب انھیں اپنے اندر قبول کرتا ہے تو یہ چھپی ہوئی قوتیں ابھرتی ہیں، سوئی ہوئی طاقتیں
جاگتی ہیں۔ تمدنی چیزوں کی ان سوئی ہوئی قوتوں کو پھر سے کسی انسان کے ذہن میں جگانے
سے اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے، اور کسی چیز سے ذہن کی تربیت اسی حد تک سمجھنی چاہیے
جس حد تک اس کی سوئی ہوئی قوتیں قبول کرنے والے کے ذہن میں جاگی ہیں ــــ مثلاً
اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹے جائے، ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی، اگر پڑھنے والے
کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری
تھیں اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا لاکر چھپایا تھا۔ سُلایا تھا۔"

ہر تعلیم کا یہ تصور اصل میں تمدنی یا تہذیبی اشیاء کے لین دین کا معاملہ ہے۔ یہ لین دین صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ لینے اور دینے والے دونوں کی طبیعت میں کسی حد تک یکسانی ہو۔ اسی بات کو ذاکر صاحب نے کسی اور جگہ مختصر الفاظ میں اور جامع طور پر یوں کہا ہے:
"ذہن معروض اور ذہن موضوع میں مطابقت اور مناسبت کا خیال رکھنا تعلیم کا بنیادی گر ہے۔" یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب سب کے لیے ایک قسم کی تعلیم اور وہ بھی فقط کتابی تعلیم کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک طلبہ کی بہت بڑی اکثریت ایسی ہے جو صرف ان اشیاء تمدنی سے اپنی ذہنی تربیت کا انتظام کرسکتی ہے، جن کا تعلق ہاتھ کے کام سے ہے، کچھ بنانے بگاڑنے سے ہے، توڑنے جوڑنے سے، غرض کچھ کرنے سے ہے۔

ذاکر صاحب تعلیم میں نری انفرادیت کے قائل نہ تھے، وہ فرد اور سماج کے باہمی رشتے کو ذہنی زندگی کی اصل سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے:

ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں .... ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی
سے پیدا ہوسکتی ہے یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جاسکتا ہے....
اسی لیے ذہنی زندگی کے لیے، جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود

لازمی ہے، بدن میں ہر حصے کی کچھ الگ الگ حیثیت بھی ضرور ہوتی ہے، مگر اسی حد تک
کہ وہ کل جسم سے وابستہ ہے اور اسی کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے،
ایک حصے کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے۔ مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر
حصہ جسم سے الگ ہو کر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔"

اسی لئے ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم محض نجی صلاحیتوں کو ترقی دینے کا نام نہیں، اپنی حیثیت پختہ کرنا، نام و نمود یا آسائش حاصل کرلینا بھی تعلیم کا مقصد نہیں۔ اور نہ ہی کسی فن میں کمال حاصل کرلینا، یا کوئی خاص مہارت پیدا کرلینا، تعلیم کا منصب ہے، تعلیم صرف اسی وقت تعلیم کہلانے کی مستحق ہے جب کہ وہ کسی جماعتی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔ فرماتے ہیں:

"تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی، مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے .. ... جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت کے لئے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس کی ہنرمندی جماعت کے انتشار کا باعث بن سکتی ہے۔"

ذاکر صاحب کے افکار پر فلاطوں اور جرمنی کے بعض مفکرین کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب نے فلاطوں کی شہرۂ آفاق تصنیف "ریاست" یا "تحقیق عدل" کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا اور اس پر ایک مقدمہ لکھا اس میں وہ فلاطوں کے بعض بنیادی خیالات سے متفق نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"حیات انفرادی کا پودا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے، من و تو یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔ بچہ ہی ماں کو ماں بناتا ہے اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو عورت میں محض بحیثیت جنس نہیں ہوتیں۔ اور ماں ہی اپنی محبت اور شیفتگی سے بچے کی ذہنی زندگی کو وہ متاع گراں مایہ دے سکتی ہے جس کا بدل دنیا کی اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی .... فلاطوں کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے

کسی جماعت، کسی ریاست کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔"

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار میں فلاطون کے اس اصول کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے جسے اس نے "تخصیص کار" کے اصول کا نام دیا ہے۔ مقدمے میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

"فلاطون فرد کو جسم اجتماعی کا ایک عضو مانتا تھا۔ اس لیے اس نے اس اخلاقی صفت پر بحث کی جس کی وجہ سے آدمی ہوائے نفس کا بندہ بن جانے کے بجائے ضبط نفس سے کام لیتا ہے اور جماعت کی فلاح کے لیے بس ایک کام اختیار کر لیتا ہے یعنی اپنے وظیفۂ اصلی کو پورا کرتا ہے۔ اس انفرادیت کے بجائے جو جمہوریت کے پردے میں پھیلی ہوئی تھی، فلاطون اجتماعی تعاون کا پیام دیتا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے تخصیص کار کا اصول پیش کرتا ہے تاکہ ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے فرض مفوضہ کو قناعت اور خوش دلی سے انجام دیتا رہے۔ اپنا "دھرم" پورا کرتا رہے کہ افلاطون کی نظر میں یہی اجتماعی زندگی کا سچا اصول یعنی عدل ہے .... اس تخصیص کار کو کامیاب بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ہر فرد اور ہر طبقے کو اس کے وظائف مخصوصہ کے لیے تیار کرنے کا انتظام کیا جائے، یہ تعلیم کا کام ہے۔"

ذاکر صاحب فلاطون کے اس نظریے کے حامی تو نہیں، جس کے مطابق وہ سماج کو تین طبقوں میں مستقل طور پر تقسیم کرتا ہے، یعنی حکمراں فلسفیوں کا طبقہ، ریاست کے محافظوں، جنگ آزماؤں کا طبقہ اور دولت پیدا کرنے والوں یا محنت کشوں کا طبقہ۔ مگر ذاکر صاحب فلاطون کے اس معاملے میں ہم نوا معلوم ہوتے ہیں کہ سماج میں تخصیص کار کا اصول کارفرما ہونا چاہئے کہ یہی وہ کام ہے جس کے ذریعے فرد نہ صرف سماج کی خدمت کر کے اسے مستحکم اور پائیدار بنا سکتا ہے بلکہ خود اپنی نشوونما کا اہتمام کر سکتا ہے۔

ذاکر صاحب فلاطوں کے اس خیال کی بھی تائید کرتے ہیں کہ تعلیم درحقیقت ریاست کا کام ہے۔ انھوں نے بنیادی قومی تعلیم کی دوسری سالانہ کانفرنس، ۱۹۴۱ء میں اس خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کی :

"میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے، یہ اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا کام ہے کہ نجی کوششیں اسے سمیٹ نہیں سکتیں لیکن اگر ریاست کسی ایک فرقے یا گروہ کی حکومت کا نام ہے، تو یہ ایسی چلتی پھرتی چھاؤں ہے کہ تعلیم کبھی زیادہ دیر تک سیدھے راستے پر نہیں چل سکے گی۔ ہاں ریاست اگر سماجی زندگی کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جس کی بنا عدل پر ہو، جو خود روز بروز اپنی اس بنیاد کو مضبوط کر کے اخلاقی ترقی کرتی جاتی ہو اور دن پر دن اپنے شہریوں کی کوشش سے ہر گروہ اور ہر طبقہ کیا ہر آدمی کی اخلاقی شخصیت کی پوری ترقی کا راستہ اس میں سہل سے اور سہل ہوتا جاتا ہو، تو پھر تعلیم ایسی ریاست کا سب سے ضروری کام ہے اس لیے کہ خود اس کی اخلاقی ترقی اس کام سے ہوتی ہے۔"

تعلیم میں اور خاص طور پر ابتدائی تعلیم میں جسے بنیادی تعلیم بھی کہتے ہیں، ذاکر صاحب نے ہاتھ کے کام پر بہت زور دیا ہے کہ یہی ان کے نزدیک اس عمر کے بچوں کی تعلیم کا موزوں اور مؤثر ذریعہ ہے مگر وہ تعلیمی کام کو میکانکی عمل بنانے کے خلاف ہیں۔ کیوں کہ بلا سوچے سمجھے کسی عمل کو بار بار دہرانا تعلیمی کام نہیں ہے۔ تعلیمی کام صرف وہی ہے جس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت ہو۔ وہ کہتے ہیں :

"سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کوئی کام کریں، ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں

ہوتا۔ کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، بامقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے، پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔"

ذاکر صاحب تعلیم کے علاوہ معاشیات کے بھی عالم تھے ۱۹۴۴-۴۵ء میں "سرمایہ داری" کے موضوع پر انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں جو لکچر دئے تھے ان سے ان کا اقتصادیات سے متعلق نقطۂ نظر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ "سرمایہ داری" کو ایک تہذیبی اور تمدنی مظہر کی حیثیت سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں سائنسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ وہ ان سماجی محرکات کی کھوج کرنا چاہتے ہیں، جن سے "سرمایہ داری" عالم وجود میں آئی اور پروان چڑھی۔ وہ اس کی اچھائی یا برائی پر حکم لگانا نہیں چاہتے۔ مگر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو اخلاقی اقدار کا پیرو ہو اور جس نے اپنی حیات عزیز کا بیشتر حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا ہو "سرمایہ داری" جیسے ایک سماجی مظہر کو خالص معروضی نقطہ نظر سے سمجھے اور سمجھائے۔ اس نقطۂ نظر کو اپنانے میں غالباً انھیں اپنے استاد زوم بارٹ کی پیروی مقصود ہے، جیساکہ انھوں نے اپنے پہلے لکچر میں خود واضح کیا ہے۔ مگر ذاکر صاحب کا آخری لکچر ان کی آرزوؤں کی غمازی کرتا ہے۔ یہاں انھوں نے آئینۂ حال میں مستقبل کی جھلک دکھائی ہے۔ فرماتے ہیں: "جب سماج کے قابو میں پوری معیشت آجائے گی اور جب وہ ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت ہو جائے گی۔ صرف اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ ضمیر اجتماعی کا حالات محنت پر اختیار ہوگا۔" آج سے پچیس سال پہلے ذاکر صاحب نے بشارت دی تھی کہ ہندوستان میں سرمایہ داری اپنے مفاد کی خاطر ضروری تنظیم کرے گی اور جب وہ نامعقول پاگلوں کی جیسی حرکتیں کر چکے گی تو سماجی ضمیر بیدار ہوگا اور اپنا زور دکھائے گا اور اس معیشت کو جس کی بنیاد ذاتی فائدے پر ہے، ایسی سماجی معیشت میں تبدیل کر دے گا جو منصوبہ بندی کے ذریعے

سب لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنا اپنا مقصد سمجھے گی ـــ اس وقت ذاکر صاحب نے کتنی
حسرت کے ساتھ کہا تھا کہ نہ جانے وہ دن کب آئے گا اور قطرے پہ گوہر ہونے تک کیا
کچھ گزرے گی ـــــ مگر ہم جانتے ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں اس منزل کی طرف ملک نے قدم
بڑھانا شروع کر دیا تھا ـــــ کیا عجب کہ ان کے خواب کی تعبیر جلد پوری ہو جائے۔

اجیت بھٹاچاریہ جی
ترجمہ: ڈاکٹر سید جعفر رضا بلگرامی

عرب و اسرائیل

(۱)

جنگ کا پس منظر: ایک نفسیاتی جائزہ

ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر جناب اجیت بھٹاچاریہ جی نے ماہ اپریل میں 'رپورٹ آن ویسٹ ایشیا' کے عنوان سے چار حصوں میں اپنے مغربی ایشیا کے سفر کے تاثرات شائع کیے تھے۔ ۱۴ مئی ۶۹ء کو انھوں نے ایک مختصر اور بلیغ اداریہ بھی لکھا۔ ہم جامعہ کالج کے استاد جناب ڈاکٹر جعفر رضا بلگرامی کے ممنون ہیں کہ ہماری درخواست پر انھوں نے قارئین جامعہ کے لیے اس کا خلاصہ اور ترجمہ کیا ہے۔ اجیت بھٹاچاریہ جی کی ہر بات سے اتفاق کرنا تو مشکل ہے لیکن اُن کے تاثرات سے ایک حد تک مغربی ایشیا کی موجودہ صورت حال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ جون، ۱۹۶۷ء میں عربوں پر اسرائیل کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی، سیاسی لحاظ سے اُسے اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچا۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ فائدہ ضرور پہونچا ہے کہ مقبوضہ علاقوں کے بیچ میں حائل ہونے سے اس کی دفاعی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے، لیکن اس کے لئے ایک خطرناک صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ آزادی فلسطین کی تحریک اور اس کے گوریلا حملوں کی شدت اور وسعت بڑھ گئی ہے۔ مغربی ایشیا میں پی، ایل، او (Palestine Liberation Organisation)

اب ایک ایسی طاقت بن گئی ہے جسے کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس تحریک کا نعرہ اب یہ نہیں ہے کہ اسرائیل کو سمندر میں ڈھکیل دو، بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین کی ایک نئی مملکت قائم کی جائے جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی ایک سیکولر نظام حکومت کے تحت برابر کے شہری اور بھائی کی حیثیت سے رہیں اور ترقی کریں۔ اس تحریک کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ یہی ایک ایسی صورت ہے جو مغربی ایشیا میں مستقل امن وسلامتی کی ضامن ہوسکتی ہے۔ فلسطینی رہنما جانتے ہیں کہ اسرائیل اس تجویز کو آسانی سے ماننے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ پھر بھی یہودیوں میں کچھ لوگ ہیں جو اِسے سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ اس سلسلہ میں اسرائیلی ملٹری انٹیلیجنس کے ڈائرکٹر جنرل، جنرل حکابی اور عالمی صہیونی تنظیم کے سابق صدر اور عالمی یہود کانگرس کے موجودہ صدر ناہم گولڈمن کے خیالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حکابی کا کہنا ہے کہ "ہم اسرائیلیوں کو عربوں کے فکروعمل کو سمجھنا چاہئے کہ وہ ہمارے وجود کو اپنی تباہی کا سبب کیوں سمجھتے ہیں، وہ ہمارے اس تصور کو کسی طرح انگیز نہیں کرسکتے کہ وہ صدیوں ہمارے وطن پر قابض رہے اور اب جبکہ ہم واپس آئے ہیں، انھیں فلسطین چھوڑ دینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا یہ نقطۂ نظر انھیں کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔" دو ماہ قبل فارن افیرز میں گولڈمن کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس نے بڑی جرات کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ "اسرائیل کی ریاست کا موجودہ کردار اور اس کی پوری ساخت اس کے وجود کے لئے خطرہ ہے۔" اس کا خیال ہے کہ اسرائیل کا موجودہ ڈھانچہ فلسطینیوں کے ساتھ ناانصافی پر مبنی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہ وہ صدیوں سے فلسطین میں رہتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ ان کا وطن ہے، ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، اور اس سے انکار ایک احمقانہ اور غیر منصفانہ فعل ہے۔ اسرائیل آخر کب تک فوجی طاقت کے بل پر قائم رہے گا؟ کیونکہ "عربوں نے ماضی میں ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد رکھی تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ ایک دن وہ اپنے

پرامن اور جنگی مقاصد کے لئے مغرب کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی میں پوری مہارت حاصل کر لیں گے۔" اسرائیل کے قیام میں اس با اثر یہودی رہنما کا اہم رول رہا ہے، لیکن آج یہ رہنما اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اسرائیل کو اپنی جنگجویانہ روش چھوڑ کر عربوں کی روایتی فیاضی سے فائدہ اٹھانا چاہئے جنھوں نے ہمیشہ یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منصفانہ اور شریفانہ سلوک کیا ہے۔ مسٹر گولڈمن نے یہودیوں کو یہ انتباہ دیا ہے کہ وقت ان کے ساتھ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ رفتہ رفتہ سیاسی اعتبار سے ان کی حیثیت کمزور ہوتی جا رہی ہے اور ترقی پسند دنیا کا ایک بڑا حصہ اُن سے مایوس اور ان کا مخالف ہو گیا ہے۔

افسوس ہے کہ اسرائیل میں گولڈمن کی طرح کے لبرل یہودیوں کی تعداد برائے نام ہے جو وقت کے تقاضوں اور مغربی ایشیا کے مسئلوں کو حقیقت پسندانہ اور منصفانہ زاویہ نگاہ سے دیکھ سکیں۔ جب تک یہ صورت نہ پیدا ہو گی اور اسرائیل کا حکمراں اور دانشور طبقہ نسلی برتری اور فوجی طاقت کے سحر سے آزاد نہ ہو گا، مغربی ایشیا کا بحران ختم نہیں ہو سکتا۔

'مدیر'

جون ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ جو بہ ظاہر فیصلہ کن نظر آتی تھی آج تک جاری ہے۔ اب امن کی توقع کرنا بیکار ہے کیونکہ خود جنگ کے اختتام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسرائیل کی فضائی فوج نے پڑوسی ملکوں کو کافی تباہ کیا ہے لیکن اس فوجی برتری کے باوجود جنگ فیصلہ کن نہیں ہو سکی ہے۔ اسرائیل اپنی فضائی طاقت کے بل بوتے پر عربوں کو ایک غیر معین مدت کے لئے بے دست و پا کر سکتا ہے لیکن "فضائی سپاہ" آباد علاقوں پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ پورے عرب ممالک کی دس کروڑ آبادی کے مقابلے میں اسرائیل کی تقریباً تیس لاکھ کی آبادی اتنی بڑی فوج نہیں تیار کر سکتی کہ وہ تمام تباہ شدہ علاقوں پر قبضہ کر لے۔

ان حالات میں اسرائیل کے پاس بس ایک ہی چارۂ کار باقی ہے کہ وہ اپنی شرطیں منوانے کے لئے اپنے پڑوسی ملکوں پر شدید اور بار بار حملے کرتا رہے اور اس طرح ان کو گفت و شنید پر مجبور کر کے اپنی مرضی کے مطابق امن قائم کرالے۔ لیکن چھ روزہ جنگ کی واضح کامیابی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جنگی برتری کے مظاہرے کے باوجود پڑوسیوں نے اب تک ہار ماننے سے انکار کیا ہے۔ ان ملکوں کے لیڈر اور ان کی حکومتیں جنگ میں ناکامیابی کے باوجود نہ صرف یہ کہ اسرائیل کو چیلنج کرتی رہتی ہیں بلکہ مستحکم بھی رہتی ہیں۔ اسی استحکام نے اسرائیل کی توقعات پر پانی پھیر دیا ہے۔ دراصل چھ روزہ جنگ میں شکست کا یہ ردعمل ہوا ہے کہ عربوں کی جنگی سرگرمیاں کچھ اور بڑھ گئی ہیں۔

اگر ایک مقررہ مدت میں فوجی شکست و فتح پر مغربی ایشیا کے حالات کا انحصار ہوتا تو اسرائیل بہت پہلے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ دراصل کچھ اور عوامل ہیں جن کی وجہ سے مغربی ایشیا شدید بحران میں مبتلا ہے۔ عربوں اور اسرائیلیوں کی تہذیب، اقدار اور طبیعت و مزاج میں ایسا زبردست اختلاف ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو گوارا کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ دونوں جانب ایسے افراد موجود ہیں جن کا سوچنے سمجھنے کا انداز اور ردعمل یکساں ہے اور ان میں آپس میں بھی اختلاف موجود ہے۔ لیکن عرب و اسرائیل کے درمیان اختلافات کی خلیج اتنی گہری اور چوڑی ہے کہ کسی سمجھوتے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

ایک لحاظ سے اسرائیل کی فوجی برتری اور مادی ترقی بھی اسرائیل اور عرب ممالک کے لئے ایک دوسرے کے قریب آنے میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ یہودیوں نے اپنی معاشی تنظیم، ٹیکنالوجی، محنت اور قابلیت کے ذریعہ ریاستی معاملات میں ممتاز و موثر حیثیت حاصل کر کے یورپ اور امریکہ کی سوسائٹی کو متاثر کیا ہے اور ان کا پڑھا لکھا طبقہ اس سوسائٹی میں غالب رہا ہے۔ اب جب کہ انھوں نے اپنا نیا ملک بسایا ہے، فطری طور پر ان سب میں ہم مقصدیت اور ہم آہنگی کا احساس بڑھ گیا ہے،

اسرائیلیوں کی خود بینی وجذبۂ مفاخرت کے مقابلہ میں عربوں میں شکست وسزا کے سامنے تسلیم ورضا کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ زندہ رہیں گے جیسا کہ اب تک رہے ہیں، چاہے اس کے لیے سو برس کا زمانہ درکار ہو۔ اسرائیلی عوام پر یہ ایک عجیب طنز ہے کہ اپنے دشمن کی اس خوش عقیدگی کو کوئی ان سے بہتر سمجھ بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ خود ایک عرصۂ دراز تک صبرو تحمل کے ساتھ جدوجہد کرکے اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے ہیں۔ صدیوں پُرانی تہذیب کے وارث مصر میں یہ تسلیم ورضا کا جذبہ اور انتظار کی صلاحیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مزاج کی اس پوری کیفیت کو عربی کے لفظ 'مالیش' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وقت کی شدت کو برداشت کیجئے چاہے اس قوت برداشت کے مقابلہ میں عملی کاوشوں کا تناسب گھٹ جائے۔ اردو میں جس لہجہ میں "یہ بھی ہوتا ہے، بھئی" ادا کیا جاتا ہے وہ بہت کچھ عربی کے اس لفظ کے معنی کے قریب ہے۔ اس انداز فکر کا منفی نتیجہ غیر ذمہ داری، غیر مستعدی اور کمزور تنظیم کی شکل میں نظر آتا ہے جبکہ کسی مہم کو سر کرنے کے لئے افراد میں پیش قدمی اور جلد فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ناموافق حالات میں بھی خوش مزاجی، ملنساری اور صبر وتحمل باقی رہتا ہے۔ یہ اسی مزاج کی کرشمہ سازی ہے کہ فوجی شکست نہ تو مصریوں کو بہتر طور پر منظم ہوجانے کا سبق سکھا سکی اور نہ ہی اُن کی اسپرٹ کو کچل سکی کہ وہ صدر ناصر کے خلاف ہوجائیں۔ وہ انتظار کرنے پر قانع ہیں۔

اِس جھگڑے کے کئی پہلو ہیں جو نسلی، مذہبی اور قومی رشتوں سے منسلک ہوکر پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ یہودی ایک وعدۂ فردا پر بھروسہ کرکے اپنے وطن سے اُنیس سو سال بچھڑے رہنے کے بعد اب واپس ہوئے ہیں۔ انھوں نے صدیوں جور وستم سہے ہیں۔ ہٹلر کی جرمنی میں وہ ساٹھ لاکھ کی تعداد میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ اب ان کو پناہ ملی ہے۔ کوئی اُن کے اِن احساسات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا جب وہ جذبات میں ڈوب کر کہتے ہیں کہ "یہ ہمارا گھر ہے، اب ہم کو یہیں مرنا جینا ہے۔" عربوں کا اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار، تین بڑی

لڑائیوں کے تجربات، اور آئے دن ہونے والے حادثات نے ان میں محاصرہ کی نفسیات پیدا کر دی ہے۔ آج اُن میں جو 'ڈسپلن' اور ان کے ہر فرد میں 'پیش قدمی' کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے بے مقصدیت اور آسودگی کے مسائل نہیں ہیں۔ ان کو ہر وقت اپنی بقا کا خیال رہتا ہے جس کے لئے وہ اپنی تمام تنظیمی اور فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے ہیں۔ یہیں پر عرب غلط فہمی کا شکار ہیں۔ شاید اُن کو یہ احساس نہیں ہے کہ دباؤ اور کشمکش کی فضا میں اسرائیلیوں کا 'مورل' اور اونچا ہو جائے گا۔

عربوں کے لیے عموماً لیکن فلسطین کے رہنے والوں کے لیے خاص طور پر اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنا اپنے وطنِ عزیز سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانے کے مترادف ہے۔ یہ احساس بڑا شدید ہے کہ ان کو صرف اس وجہ سے گھر سے بے گھر کر دیا گیا ہے تاکہ ان کے وطن میں باہر کی کی ایک مغرب زدہ قوم کو لاکر بسا دیا جائے۔ استعمار اور سفید فام اقوام کے احساس برتری کی یادیں جو ابھی تازہ ہیں، اس احساس محرومی کو اس قدر شدید اور تلخ بنا دیتی ہیں کہ ان کی اپنی کمزوریاں اور ناکامیاں درگذر کی مستحق قرار پاتی ہیں۔

مذہبی سطح پر یہ توجیہہ پیش کی جاتی ہے کہ اس علاقے میں نہ صرف یہ کہ یہودیوں کے بلکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے بھی مقدس آثار موجود ہیں، پھر آخر یہودیوں ہی کے لیے وطن کیوں؟ ہم کو اجاڑ کر ہٹلر کے ہاتھوں ستم رسیدہ لوگوں کو بسانا کہاں تک مناسب ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا کوئی مناسب جواب نہیں۔ تین لڑائیوں میں اسرائیل نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اُن علاقوں سے نکالے ہوئے تقریباً بیس لاکھ عرب پناہ گزینوں پر نظر پڑتے ہی اس مسئلہ کا انسانی پہلو پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ ان کی بھاری اکثریت جس میں وہ فلسطینی عرب بھی شامل ہیں جنھیں اپنے وطن سے نکلے ہوئے ۲۳ برس ہو گئے ہیں، اب تک کیمپوں میں زندگی گزار رہے ہیں اور دوسری جگہ بسنے سے صرف اس وجہ سے انکار کرتے ہیں کہ شاید ان کے نصیب میں کبھی فلسطین واپس جانا لکھا ہو۔

اِس طرح تاریخی حقائق، تہذیبی مسائل اور مذہبی احساسات نے مغربی ایشیا کی جنگ کو پیچیدہ اور دور رس نتائج کا حامل بنا دیا ہے۔ اسرائیل ایک ایسا آزاد ملک ہے جس کا مغربی طرزِ فکر اور غالب رہنے کا جذبہ ایشیا میں نوآبادیاتی نظام کے تجربوں کی ایک ناخوشگوار یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ اس جذبے اور دوسرے تہذیبی رشتوں کی وجہ سے ایشیا کے تمام ممالک میں عربوں کے لئے ایک ہمدردی پائی جاتی ہے۔ مذہبی سطح پر بھی عربوں کو ان تمام ممالک کی ہمدردیاں حاصل ہے جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، چاہے ایسے ممالک کے سیاسی مفاد مغرب ہی سے کیوں نہ وابستہ ہوں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے اعتبار سے اور اس لحاظ سے بھی کہ یہودیوں کا مغربی تہذیب کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے ترقی یافتہ مغربی ممالک اسرائیل سے ایک ذہنی وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ ایسے تمام ممالک کی حمایت اسرائیل کو حاصل ہے جہاں یہودیوں کی بااثر اقلیت آباد ہے۔ اس طرح جذباتی سطح پر بھی مغربی ایشیا کی جنگ کا دائرہ وسیع ہے۔

دو بڑی طاقتوں نے طرفین کا ساتھ دے کر اختلاف کو اور شدید کر دیا ہے۔ مغربی اقدار کی ہم آہنگی اور یہودی فرقے کی موثر حیثیت نے امریکہ کو اسرائیل کی حمایت پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن آخر کس حد تک امریکی حکومت اپنی پوزیشن اور اثر کو داؤں پر لگا کر اور عرب ممالک کی مخالفت مول لے کر اسرائیل کی حمایت کر سکے گی؟ امریکی حکومت جس انداز میں اسرائیل کی امداد کر رہی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ نے یہ قیاس کر لیا ہے کہ ٹیکنالوجی کے میدان میں اسرائیل کی برتری اس کو اس علاقہ میں غالب رکھے گی۔

عربوں کی حمایت کر کے روس نے مغربی ایشیا میں بہت سے سیاسی و معاشی فائدے اٹھائے ہیں۔ جو حکومتیں پہلے مغرب کی طرف جھکتی تھیں اب وہ بالاعلان ایسا نہیں کر سکتیں۔ معاشی ترقیاتی اسکیموں میں بھی روس کی شرکت بڑے پیمانہ پر ہو گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اب روس کے جہاز بحیرۂ روم کی بندرگاہوں تک پہونچنے لگے ہیں جس کا کہ روس ایک عرصہ سے خواہشمند تھا

لیکن اس کی یہ خواہش اب تک کوئی عملی شکل اختیار نہیں کر سکی تھی۔

دونوں بڑی طاقتیں نہ صرف یہ کہ اس علاقہ کے ملکوں کو خطرناک ہتھیار سپلائی کر کے مالی منفعت حاصل کر رہی ہیں بلکہ مغربی ایشیا کی جنگ میں شرکت کئے بغیر اپنے جنگی اسلحوں اور ہوائی جہازوں کی کارپردازی اور صلابت کا اندازہ بھی کر رہی ہیں۔

(۲)
موجودہ صورتحال

اُردن کی گھاٹی میں اسرائیل اور اُردن کی فوجیں ایک دوسرے کے روبرو کھڑی ہیں لیکن ایک فوج کے سپاہی دوسری فوج کے سپاہی سے بات چیت نہیں کرتے، دریائے اُردن کے مغرب میں مقبوضہ علاقے سے جو عرب خاندان آتے ہیں، اسرائیلی سپاہی ان سے کچھ سوالات کرکے دریا پار کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پھر اُردن کی پولیس اُن کو دیکھ بھال کر اپنے علاقہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دیتی ہے۔ اِدھر ٹیکسیاں منتظر رہتی ہیں جنھیں لے کر لوگ عمان کی طرف چلے جاتے ہیں۔

ہاں، دریائے اُردن سے کچھ دور پہاڑیوں کی ڈھلان پر کرامہ نام کا قصبہ ہے جو ۱۹۶۸ء کے اسرائیلی حملہ میں اس حد تک تباہ ہو چکا ہے کہ وہاں آج ایک فردِ بشر بھی نظر نہیں آتا۔ یہ اب بھی کبھی کبھی غیر متوقع طور پر اسرائیل کی بمباری کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔ کئی ہزار عرب مہاجرین نے کرامہ میں پناہ لی تھی، لیکن اب وہ عمان کے باہر کیمپ میں سرد ہواؤں کے تھپیڑے مستقل طور پر برداشت کر رہے ہیں۔ اِن میں کچھ ایسے ہیں جن کو تین بار ہٹنا پڑا ہے۔ پہلی بار اپنا وطن چھوڑ کر مغربی ساحل پر آباد کئے گئے جبکہ اسرائیل کی مملکت بنی، دوسری بار اُردن کی گھاٹی میں بسائے گئے جبکہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مغربی ساحل پر قبضہ ہو گیا اور تیسری بار عمان کے باہر کیمپ میں بسائے گئے جبکہ دس ماہ بعد ۱۹۶۸ء میں کرامہ پر حملہ ہوا۔

گھاٹی کی زرخیز زمین خشک ہو رہی ہے کیونکہ نہریں اور بجلی کے کنویں تباہ ہو چکے ہیں۔ اسرائیلی کسان زمین کے کچھ قطعات اب بھی جوتتے ہیں لیکن کام کرنے سے قبل خندق کھود لیتے ہیں اور شام کے وقت پہاڑیوں میں جا چھپتے ہیں۔ شمال کی جانب چند میل دور جہاں دریائے اردن بحیرۂ گیلیلی سے باہر نکلتا ہے، تناؤ اور انتشار کی کوئی کیفیت نظر نہیں آتی۔ جنگ کی باتیں زراعتی فارموں میں کھانے کی میز پر بھی کم ہی ہوتی ہیں لیکن ہر ڈائیننگ ہال کے سامنے ایک زمین دوز تہہ خانہ ضرور ملتا ہے۔ پوچھئے تو بلا ارادہ جواب ملے گا "فرض کیجئے ہم کھاتے ہوئے پکڑے جائیں تو؟" ہر گھر کے خوبصورت لانوں میں اس طرح کی پناہ گاہیں بنی ہوئی ہیں جن میں رات کے وقت بچے سلا دیے جاتے ہیں۔ دن میں وہ شکستہ اور شکست خوردہ ٹینکوں کے ارد گرد کھیلتے نظر آتے ہیں۔

بحیرۂ گیلیلی کے شمال میں گولان کی پہاڑیاں ہیں جن کو چھ روزہ جنگ میں شام سے چھین لیا گیا ہے۔ اب یہاں سیاح آتے ہیں اور اس حسین خطۂ ارضی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ جنگ بندی لائن اب اگرچہ دمشق کے پاس تک پہونچ گئی ہے لیکن اس سے کسی طرف کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہوتا۔ لیکن لبنان میں صورت حال ذرا مختلف ہے۔ لبنان کی مادی خوشحالی کا انحصار تجارت پر ہے اور یہ تجارت اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے، ایک بے یقینی کی کیفیت ہر جگہ پائی جاتی ہے جو یقیناً اسرائیلی حملوں کا نتیجہ ہے لیکن اس بے یقینی کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ آزادیٔ فلسطین کی تنظیم (PLO) کے گوریلا سرزمین لبنان سے اسرائیل پر حملہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں مخلوط ردِعمل پایا جاتا ہے۔ ایک طرف اسرائیل سے انتقام لینے کا عام جذبہ ہے جو اِس عمل کی تائید پر مجبور کرتا ہے دوسری طرف معاشی و تجارتی نقصان کے پیش نظر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گوریلا سرگرمیاں اسرائیل کے مقابلہ میں خود لبنان کے لیے زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ اس طرح لبنان "ملکی مفاد" اور "عرب قومی مقاصد" کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

قدامت پسند اور عیسائی فلانگسٹ پارٹی کے لیڈر اور لبنان کی حکومت کے وزیر

شیخ گیمایل نے کہا کہ " PLO اسرائیل کو اتنا نقصان نہیں پہونچا رہا ہے جتنا کہ وہ لبنان کو تباہ کر رہا ہے "۔ ایک ہفتہ کے بعد PLO نے اُن کے لڑکے کو اغوا کر لیا اور فلانگسٹ اور گوریلا کے درمیان بندوقوں کی لڑائی چھڑ گئی۔ اسی طرح عمّان میں بھی PLO اور حکومت کے درمیان ایک "مضطرب صلح" کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ دو ماہ قبل عمان کی فوج اور PLO کے گوریلا میں تصادم ہو گیا جس کے بعد گوریلا نے یہ منظور کیا کہ وہ اس شرط پر شہر میں مسلح ہو کر نہیں گھومیں گے کہ سرحدی علاقوں میں اُن کو پوری آزادی ہوگی۔ اسی طرح شاہ حسین پر یہ لوگ کھلم کھلا تنقید کرتے ہیں اور حکومت اردن کے اس دعوے پر خفا ہوتے ہیں کہ اسرائیل کا قبضہ ختم ہوتے ہی مغربی ساحل پر اردن کا مستقل قبضہ باقی رہے گا۔

لبنان کی سرزمین سے اسرائیل پر حملہ کرنے میں PLO کے گوریلا اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی لڑائی میں اسرائیل نے مصر، اردن اور شام کے علاقے چھین لئے ہیں اور اس کی وجہ سے اسرائیل کی زمین اُن کی زد سے دور ہو گئی ہے۔ اب وہ لبنان کی سرزمین ہی سے آسانی سے حملہ کر سکتے ہیں جس کا کوئی علاقہ اب تک اسرائیل کے قبضہ میں نہیں گیا ہے اور جس کی وجہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لبنان اور اسرائیل میں کسی طرح کا کوئی معاہدہ ہو جائے۔ لیکن لبنان کی سرزمین کو استعمال کرنے کی اس دلیل سے لبنان کے لوگ مطمئن نہیں ہیں۔

قاہرہ میں رات کے وقت روشنیاں مدھم رہتی ہیں۔ اہم عمارتوں کے سامنے اور قاہرہ میوزیم کے قیمتی مجسموں کے ارد گرد بالو بھرے تھیلے لگا دیئے گئے ہیں۔ نہر سویز کے علاقے سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی وجہ سے قاہرہ کی آبادی بڑھ کر پچاس لاکھ ہو گئی ہے، اس کے باوجود اندازِ زندگی ویسا ہی دوستانہ، مخلصانہ، مہذب اور پُر سکون ہے۔ بالو بھرے تھیلوں کے علاوہ کوئی اور ایسی علامت نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ قاہرہ پر بمباری ہو سکتی ہے جبکہ تقریباً روزانہ نہر سویز جو قاہرہ سے صرف ۸۰ میل دور ہے اسرائیلی حملوں کا نشانہ بنی رہتی ہے،

ہوائی جہاز ارد گرد اڑتے رہتے ہیں، فوجی ذخیروں کو تباہ کرتے ہیں اور کبھی کبھی مصر میں دور تک داخل ہو جاتے ہیں۔ غیر متوقع طور پر غیر فوجی جہازوں کے لئے قاہرہ کے ہوائی اڈے کے بند ہو جانے کا بھی اعلان اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ نئے میزائل کو چلانے کی ٹریننگ دینے کے لئے تجربہ کار روسی ہوا باز آرہے ہیں لیکن قاہرہ میں اس کی خبر باہر کی اخباروں سے ملتی ہے۔ اندرونی خبر رساں ایجنسیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

اسرائیل میں کہیں بھی بلیک آؤٹ نہیں ہوتا۔ صرف سرحدی علاقوں میں توپ خانوں اور گوریلا حملوں سے حفاظت کی غرض سے بالو بھرے تھیلے اور پناہ گاہیں نظر آتی ہیں۔ چھ روزہ جنگ میں جن علاقوں کو حاصل کر لیا گیا ہے وہ حملوں سے حفاظت کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مرکزی آبادی یا سڑکوں پر کوئی ٹینک، بندوق یا مسلح سپاہی نظر نہیں آتے۔ اس سے خود اعتمادی اور فضائی برتری کا پتہ چلتا ہے۔ ان کو اطمینان ہے کہ وہ جب چاہیں گے کسی عرب ملک کو اپنا نشانہ بنا لیں گے۔ وقتاً فوقتاً وہ اس کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں تبدیلی صرف اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ یا تو اسرائیل کی فضائی برتری کم ہو جائے یا پھر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کسی مخصوص مقام کو نشانہ بنانے کی پالیسی ترک کر کے وہ عام تباہ کن حملے شروع کر دے۔

(۳)

اسرائیل

یورو شلم ایک بار پھر قومی و مذہبی گرمجوشی کا مرکز بن گیا ہے۔ یہ عرب اور اسرائیل کے جھگڑے کا مرکزی مقام ہے۔ چھ روزہ جنگ میں حاصل کئے گئے مقبوضہ علاقوں کو اب بھی سرکاری طور پر "اسرائیلی تنظیم کے تحت کے علاقے" کہا جاتا ہے، لیکن یورو شلم کا پرانا شہر اور دوسرے حصے جو اسرائیل کے زیرِ حکومت نہ تھے اب اسرائیلی حکومت کا اٹوٹ حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

اسرائیلی تنظیم کے تحت علاقوں میں مروجہ قانونی، تعلیمی اور تنظیمی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں

ہوئی ہے۔ نقشہ وہی ہے جو جون ۱۹۶۷ء سے پہلے تھا۔ صرف فرق یہ ہے کہ اب اختیار اعلیٰ اسرائیلی فوجی گورنر کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن یوروشلم میں اس طرح کا بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ تین سال قبل پرانے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد اسرائیل نے کچھ اہم تبدیلیاں کیں۔ وہ تنگ سڑک جو دیوارِ گریہ تک جاتی ہے، آس پاس کے مکانات منہدم کرکے کشادہ و روشن کردی گئی ہے۔ یہ تبدیلیاں اس بات کی علامت ہیں کہ یہودیوں نے پورے یوروشلم پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ دیوارِ گریہ ہی وہ مقام ہے جہاں وزیر دفاع موشے دایان نے جذبات بھری تقریر کی تھی کہ "ہم اب اس مقدس ترین مقام پر واپس آگئے ہیں اور اس سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔"

بائیس سال قبل اسرائیلی مملکت وجود میں آئی۔ عربوں سے پہلی جھڑپ میں اسرائیل نے اپنی سرحد یوروشلم تک پہونچادی تھی (اقوام متحدہ کی تجویز تھی کہ یوروشلم کو بین الاقوامی نوعیت کا شہر بنایا جائے)۔ نیا شہر جو آباد ہوا اس میں اسرائیل کی پارلیمنٹ، دوسرے سرکاری دفاتر اور ہٹلر کے ہاتھوں ستائے ہوئے ۶۰ لاکھ آفت رسیدہ یہودیوں کی یادگار میں عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن پرانے شہر پر قبضہ (جس میں دیوارِ گریہ موجود ہے) جون ۱۹۶۷ء میں اردن سے لڑائی کے بعد ہوا۔ قبضہ کے تین ہفتہ کے اندر اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ پورا یوروشلم اسرائیل کی عملداری میں ہوگا۔ چونکہ اب "گریہ" کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے اس لئے اس دیوار کا رواجی نام بدل کر "مغربی دیوار" کر دیا گیا ہے۔ لیکن پرانے شہر میں مغربی دیوار ہی مقدس مقام نہیں ہے۔ قبۃ الصخریٰ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے، کہا جاتا ہے کہ اپنے بیٹے اسحاقؑ کی قربانی کی پیشکش کی تھی یہیں ہے، اور حضرت ابراہیمؑ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں تینوں کے پیغمبر ہیں، اور یہی مقام ہے جہاں سے پیغمبرِ اسلامؐ معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ بعد میں اس کے قریب مسجدِ اقصیٰ تعمیر کر دی گئی تھی۔ یہیں وہ مقام بھی ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ اب اس جگہ عیسائیوں کا مقدس کلیسا ہے جو (church of Holy Sepulchre) کے نام سے موسوم ہے

اسرائیلی سپاہیوں نے پرانے شہر پر قبضہ کرتے وقت مذہبی مراکز کو نقصان نہیں پہونچایا۔

یہ مذہبی مراکز اپنے پرانے سرپرستوں کی نگرانی میں رہے۔ پرانے شہر میں کسی طرح کی کشیدگی یا انتشار کی علامت نہیں پائی جاتی۔ عرب تاجر باہر سے آنے والے زائرین اور سیاحوں کے ساتھ اچھی تجارت کر رہے ہیں۔ گلیاں اور کوچے ہر مذہب کے ماننے والوں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردن کی حکومت کے تحت میونسپل بورڈ یا محکمۂ پولیس میں کام کرنے والوں کا تقرر اسرائیل نے پھر سے کر لیا ہے۔ یوروشلم نہ معلوم کتنے حکمرانوں کی قلمرو میں رہ چکا ہے اور اس نے تاریخ کے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں، اس لئے اسرائیل کے قبضہ یا مسجدِ اقصیٰ میں آگ لگ جانے سے خود اتنا متاثر نہیں ہے جتنا کہ باہر کی دنیا۔ اسرائیل کو اعتماد ہے کہ وہ یوروشلم پر مکمل قبضہ رکھے گا۔ دوسرے مقبوضہ علاقوں کی بہ نسبت اس شہر پر قبضہ رکھنے کی توجیہہ الگ ہے۔ سینائی، گولان کی پہاڑیاں اور اردن کے مغربی ساحل کے علاقے پر قبضہ حفاظت کی غرض سے ہے جبکہ یوروشلم کے قبضہ کے ساتھ قومی و مذہبی جذبات وابستہ ہیں۔

حفاظت کی غرض سے ہی سہی لیکن اسرائیل مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے، چاہے عرب سرحدی حفاظت کی ذمہ داری خود ہی کیوں نہ لے لیں۔ اسرائیل کے وزیر خارجہ نے کہا کہ نہر سوئیز اور دریائے اردن مخالف فوجوں کو علٰحدہ کرتے ہیں۔ اگر محدود دست برداری قبول کر لی جائے تو یہ فائدہ ختم ہو جائے گا اور کوئی مستقل معاہدہ ہونے سے قبل پہلے کی سرحدوں تک جانے کا مطالبہ بھی شدید ہو جائے گا۔

اسرائیل اب تک کسی ثالث کے ذریعہ فریقین میں سمجھوتے کی مخالفت کر رہا ہے۔ وہ عرب و اسرائیل کے درمیان براہِ راست گفت و شنید پر زور دیتا ہے۔ اگر کوئی ثالث مترجم کی حیثیت سے فریقین کے خیالات کو ایک دوسرے تک پہونچانے کا کام کرے تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ سمجھوتے کے اس طریق کار کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسرائیل کی تمام جنگی کامیابیوں کے باوجود عربوں نے اسرائیل کے وجود کو اب تک تسلیم نہیں کیا ہے۔ اسرائیل یہ جانتا ہے کہ عرب ممالک جب تک اِسے تسلیم نہ کر لیں خوشحالی کا چین اور آرام سے زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ براہ راست گفتگو کے بعد دست بردار

ہو جانے کی شرط دراصل اپنا وجود تسلیم کرانے کی قیمت ہے جو اسرائیل ادا کرنے کو تیار ہے۔

لیکن اسرائیل معاہدے پر بات چیت ہونے سے قبل یہ بھی بتلانا نہیں چاہتا کہ وہ کہاں تک دست بردار ہو گا۔ قبل از وقت اس اعلان کا مطلب معاہدے سے اٹھائے جانے والے فلئے کو کمزور کرنا ہے۔ اسرائیل یوروشلم کے علاوہ اور کسی علاقے پر قابض ہونے کا خواہشمند نہیں ہے۔ ان علاقوں پر قبضہ رکھنے کا مقصد صرف سرحدی حفاظت ہے۔ گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنے کے بعد نشیب میں بسنے والے شام کے تمام لوگ اسرائیل کی زد میں ہیں۔ ہاں وہ گولان کی پہاڑیوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے گا اگر سرحد کو مکمل طور پر فوج سے پاک کر دیا جائے۔

اسرائیل کو مغربی ساحل کا علاقہ اپنے پاس رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن جب تک کہ کوئی پرامن سمجھوتہ نہ ہو جائے سرحدی حفاظت کی غرض سے اس پر قبضہ رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح خلیج عقبہ میں آزادانہ جہازرانی کا حق مل جانے کے بعد ہی اسرائیل مصر کو سینائی کا علاقہ واپس کر سکتا ہے۔

مقبوضہ علاقوں کے حدود کے تعین میں اسرائیل میں اختلاف ہے۔ کچھ اعتدال پسند عناصر موجودہ علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں جبکہ انتہا پسند عناصر کچھ اور علاقے بھی لے لینا چاہتے ہیں۔ معاہدے میں جتنی تاخیر ہوتی جاتی ہے متوازن خیالات کے لوگوں کی اکثریت بڑھتی جاتی ہے جو تھوڑی رد و بدل کے ساتھ پرانی سرحد باقی رکھنے کی حمایت کرتے ہیں، اگرچہ توسیع پسند عناصر کے حامی بھی ہیں لیکن وہ اکثریت میں نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عرب اخبارات میں اس کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل میں اس نقطۂ نظر کے لوگ اکثریت میں ہیں۔

اسرائیل میں اختلاف صرف سیاسی نقطۂ نظر ہی کا نہیں ہے، امریکہ اور یوروپ سے آئے ہوئے سفید فام یہودیوں اور دوسرے براعظموں سے آئے ہوئے غیر سفید فام یہودیوں کے درمیان بھی اختلاف موجود ہے۔ لیکن یہ اختلاف رنگ کا نہیں ہے بلکہ جفاکشی، دولتمندی اور خوش حالی کا اختلاف ہے جو سفید فام یہودیوں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اور جو غیر سفید فام

یہودیوں میں مفقود ہے۔ ہندوستان سے جاکر بسنے والے یہودیوں کو پہلے ناساعد حالات کی شکایت تھی لیکن اب وہ بھی اسرائیل کی تعمیر میں اپنے رول پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ایک اور اختلاف ہے جو رجعت پسند اور لبرل خیال کے یہودیوں میں نظر آتا ہے۔ لبرل خیال کے یہودی اسرائیل کو ایک نیشن یا قوم مانتے ہیں نہ کہ ایک مذہبی فرقہ۔ ان کا خیال ہے کہ اسرائیل ایک سیکولر حکومت ہے جس میں عربوں کو چاہے وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، برابر کا حق حاصل ہے۔ (عربوں کو ووٹ دینے اور پارلیمنٹ میں اپنے نمائندے بھیجنے کا اختیار بھی ملا ہوا ہے) لیکن رجعت پسند عناصر اسرائیلی مملکت اور دوسرے ملکوں میں بسنے والے یہودیوں کے درمیان کوئی فرق برقرار رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ مذہب کی بنیاد پر ساری دنیا کے یہودیوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں ـــــ لیکن یہ سارے اختلافات عربوں کے مقابلے میں ختم ہوجاتے ہیں۔ کسی معیار پر پرکھئے اسرائیلی یہودی مستعد، متحد اور مہم جو ہیں۔ فوجی کامیابی کے باوجود اسرائیل اور اُس کے مقبوضہ علاقوں کی شہری زندگی میں فوج کا غلبہ ناپید ہے۔ فوج دراصل اسرائیل کی کامیابی کی ذمہ دار بھی نہیں ہے۔ بنیادی طور پر اسرائیلی شہریوں کی ذمہ دارانہ قوت اقدام اس کامیابی کی ضامن ہے۔ تل ابیب کے کسان اس ذمہ دارانہ قوت اقدام کی ایک مثال ہیں جو ۲ بجے رات کو اٹھ کر پھل، پھول اور ترکاریاں توڑتے ہیں تاکہ مغربی یوروپ جانے کے لیے پہلا ہوائی جہاز پکڑ سکیں اور جہاں پہونچ کر ان کے پھل، پھول اور ترکاریاں اٹلی اور اسپین سے آئے ہوئے پھل، پھول اور ترکاریوں سے، بہ لحاظ معیار اور تازگی، ہمسری کا دعویٰ کرسکیں۔

(۴)

عرب

عربوں کے عمل میں وہ مقصدیت اور مطابقت نظر نہیں آتی جو اسرائیلیوں کا خاصہ ہے۔ ناانصافی، فوجی شکست اور مایوسی عربوں کے درمیان اتحاد کی بنیاد ہے۔ یہ وہ یکساں جذبہ ہے

جو عرب سماج کے ہر طبقہ میں پایا جاتا ہے، اور جس کی شدت کو کوئی حکومت یا لیڈر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ محض جذباتی شدت ہے جو مربوط طرزِ عمل سے بے نیاز ہے اور جس کی وجہ سے کسی مخصوص مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔ عربوں کی یہ کیفیت مغلوب ہونے یا صلح کرنے پر راضی نہیں ہے لیکن ساتھ ہی فتح کا بھی یقین نہیں دلاتی۔

عرب حکومتوں اور گوریلا تنظیموں دونوں کا مقصد مقبوضہ علاقوں کو اسرائیل سے حاصل کرنا اور عربوں کے لیے فلسطین کو آزاد کرنا ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ترجیح وتخصیص میں بڑا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف چھ روزہ جنگ سے پہلے مخفی تھا اُس وقت صدر ناصر یہ کہہ سکتے تھے کہ اسرائیل مملکت کو تباہ کر دو۔ اُس وقت فلسطین کے انتہا پسند گوریلا لیڈر بھی یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ یہودیوں کو سمندر میں پھینک دو۔ لیکن شکست کے بعد عرب ملکوں نے دنیا سے اپیل کی کہ وہ اسرائیل کو مقبوضہ علاقوں سے دست بردار ہو جانے کے لئے راضی کریں، اگرچہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ جون ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں میں اسرائیلی مملکت کے باقی رہنے کے حق کو انھوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ عربوں نے اسرائیلی مملکت کے وجود کو سلامتی کونسل کے اس رزولیوشن کو مان کر بھی تسلیم کر لیا جس میں کہا گیا تھا کہ

"اسرائیل ہٹ جائے گا اور اِس علاقے (مغربی ایشیا) کے تمام ملکوں کی علاقائی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا احترام کیا جائے گا۔"

لیکن ان رعایتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ یورشلم میں اسرائیل اپنی پوزیشن تبدیل کئے بغیر عربوں سے اپنا وجود تسلیم کرانے کا عملی ثبوت چاہتا ہے۔ اس سے فلسطین کے رہنے والے بھڑک گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چھ روزہ جنگ سے پہلے کی سرحدوں تک واپس جانے سے اُن کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسطین کی نئی مملکت کے دوبارہ قائم ہونے کی امید یا اقوام متحدہ کی پیش کردہ تجویز کے مطابق ایک الگ مملکت میں اکثریت کے علاقے بنا دینے کی اسکیم کو ختم سمجھا جائے۔

اگرچہ چھ روزہ جنگ کی پہلی پوزیشن پر محض واپس جانے کے خلاف فلسطین کی رائے عامہ متحد ہے لیکن دوسرے مسائل میں اُن میں اختلاف ہے ۔ انتہا پسند عناصر یہودیوں کو دربدر کرنے کی اب بات نہیں کرتے ۔ PLO کے لیڈر یاسر عرفات اب مسئلہ کا حل زیادہ جمہوری انداز سے پیش کرتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ پورا فلسطین معہ اسرائیل کے ایک سیکولر حکومت ہونا چاہیے جس میں یہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے حقوق مساوی ہوں ۔ موجودہ یہودی آبادی اس شرط پر قبول کی جاسکتی ہے کہ باہر سے آکر بسنے والوں کا سلسلہ ختم کر دیا جائے ۔ لیکن اس حل میں صرف ایک کمزوری ہے اور وہ یہ کہ اسرائیل کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور وہ فلسطینی مملکت میں اقلیت میں ہو جائیں گے ۔ اس حل کو وہ فاتح کیسے قبول کر سکتا ہے جس نے اب تک اپنی فوجی برتری برقرار رکھی ہو ۔

معتدل عناصر چاہتے ہیں کہ فلسطین کی ایک علٰحدہ عرب مملکت بنا دی جائے جو صرف دریائے اردن کے مغرب کے علاقے اور غازہ پٹی پر مشتمل ہو، حالانکہ اقوام متحدہ نے جب یہ تجویز پیش کی تھی تو اُس وقت عربوں نے اسے نامنظور کر دیا تھا ۔ پھر بھی اگر اسرائیل کو اس فارمولے کو ماننے پر رضامند بھی کر لیا جائے تو اُردن کو یہ منظور نہ ہوگا جس نے ۱۹۴۸ء میں دریائے اردن کے مغرب میں مذکورہ علاقے کو اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا تھا ۔ تمام عرب ممالک میں یہی علاقہ سب سے زیادہ زرخیز سمجھا جاتا ہے، پھر فلسطین کے لوگ بھی تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں ۔ اگر یہ علاقہ ایک علٰحدہ مملکت کی صورت میں اردن کے ہاتھ سے نکل گیا تو اسے ہر لحاظ سے کافی نقصان ہوگا ۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ فلسطینی پناہ گزینوں اور اردن کے رہنے والوں کے درمیان مفاد کا تصادم ہے ۔ عرب عوام کے جذبات اور باہر کی مالی امداد سے PLO تو مضبوط ہو رہی ہے، لیکن ساتھ ہی شاہ حسین کے اختیارات ختم ہوتے جا رہے ہیں ۔ اس لیے اردن چاہتا ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو سکے پرامن معاہدہ ہو جائے ۔ لیکن ساتھ ہی عوامی جذبات اردن کو مجبور کرتے

ہیں کہ وہ اپنی جنگی دمنع کو باقی رکھے۔ اردن کے وزیر داخلہ نے کہا ہے کہ ان کی حکومت روس سے نئی طرز کے اسلحے لینے کے لئے رضامند ہے اس سے اردن کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے۔

چونکہ لبنان کا کوئی علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں نہیں گیا ہے اس لیے وہ اس کو مشتعل نہیں کرنا چاہتا۔ لبنان نے بڑی حد تک سوئٹزرلینڈ کا تتبع کیا ہے۔ اسرائیل کے پڑوسیوں میں لبنان ہی معاشی حیثیت سے ترقی یافتہ اور ریاستی حیثیت سے منظم ملک ہے۔ لیکن اس سرزمین سے فلسطین کے گوریلا اسرائیل پر حملے کرتے ہیں اور پھر اسرائیل جوابی حملہ کرتا ہے جس کی وجہ سے تجارت کو سخت نقصان پہونچتا ہے اور ایک بار غیر یقینی سی کیفیت مستقل طور پر موجود رہتی ہے۔ اس سے جذبات اور مفاد میں ایک ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے جو خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

متحدہ عرب جمہوریہ اور شام کی حکومتیں فلسطینیوں کی کارکردگی سے زیادہ مضطرب اور پریشان نہیں۔ اُن کے جنگی انقلابی اعلانات PLO کی پالیسی کے عین مطابق ہیں لیکن اسرائیل نے سنائی اور گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کرکے گوریلوں کی کارروائی کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان گوریلوں کو قاہرہ اور دمشق سے مالی امداد دی جاتی ہے اور ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے لیکن یہ اپنے عملی اقدام کے لئے اردن اور لبنان کے علاقے استعمال کرتے ہیں عمان اور بیروت میں اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دراصل PLO کو اسرائیل کے خلاف نہیں خود اُن کے خلاف بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی ایشیا میں ترقی پسند اور قدامت پسند حکومتوں کے تعلقات میں کھینچاؤ کی وجہ سے مکمل طور پر فوجی تعاون بھی مفقود ہے۔

چونکہ لبنان کے علاوہ اور تمام عرب ممالک میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لیے مذہب ان سب میں ایک نقطۂ اتحاد ہے۔ یوروشلم کے مقدس مقامات چھن جانے اور خاص طور سے پچھلے سال مسجد اقصیٰ میں آگ لگ جانے کے بعد یہ اتحاد اور بھی نمایاں ہوگیا ہے، یہاں تک کہ شام کی بعثی حکومت کے لیڈر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر ناصر نے ان واقعات کے پیش نظر اسرائیل

کے خلاف جنگ کو "جہاد" کا درجہ دے دیا ہے۔ بحالت جنگ اس اتحاد سے تقویت ضرور پہونچتی ہے اور دوسرے اسلامی حکومتوں سے حمایت بھی حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ اس سے قدامت پرست عناصر کو تقویت ملتی ہے۔ قدامت پرستی سے اسرائیل جیسے ترقی یافتہ ملک کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے بھی عرب اتحاد کمزور ہے۔ لبنان ایک خوش حال ملک ہے۔ کھلی ہوئی سوسائٹی ہے اور کثیر الجماعت جمہوریت ہے جو بڑی متوازن ہے۔ اس کے برخلاف شام قدامت پرست، مطلق العنان اور فوجی ملک ہے۔ اردن لبرل ہے اور نظم ونسق کے اعتبار سے ایک اچھی اور منظم بادشاہت ہے جبکہ متحدہ عرب جمہوریہ سماجی حیثیت سے ایک کھلی ہوئی اور سیاسی حیثیت سے ایک بند سوسائٹی ہے۔

عرب ممالک میں متحدہ عرب جمہوریہ ہی سب سے گنجان آبادی کا ملک ہے جو اسرائیل کا مقابلہ کر رہا ہے۔ عرب اتحاد میں اسی کو مرکزیت حاصل ہے، اور علاقے اور آمدنی کے اعتبار سے اسی کو اسرائیل کے ہاتھوں سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کو ایک طرف نہر سوئز کے علاقوں کی تمام آبادی کو بسانا پڑا ہے اور دوسری طرف نہر سوئز بند ہوجانے کی وجہ سے مستقل طور پر مالی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ دیوالیہ نہیں ہے۔ مالدار عرب ممالک کی مالی امداد اور مغربی ریگستان میں تیل کی دریافت نے اس ملک کی معاشی حالت سدھار دی ہے۔ افسروں کا کہنا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اپنے بین الاقوامی معاہدے پورے کر رہا ہے، یہاں تک کہ اسوان بند کے قرض کی ادائیگی بھی معمول کے مطابق ہو رہی ہے۔ حکومت سب کو روزگار فراہم کرنے میں کامیاب ہے اور بنیادی غذائی اشیاء اتنی قیمتوں میں مہیا کرتی ہے کہ غریب سے غریب بھی ان کو خرید سکتا ہے۔ "ہائی ڈیم" (جس کی تکمیل اس سال ہو جائے گی) بن جانے کی وجہ سے متحدہ عرب جمہوریہ نے ایک تہائی ریگستان کو زرخیز بنا لیا ہے لیکن یہ سماجی ومعاشی ترقی ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور اُس معیار پر نہیں پہونچی ہے جہاں پہونچ کر ملک

تنظیمی اور تکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ کہلاتا ہے ۔ اس منزل تک پہونچنے کے بعد ہی کسی فوجی کامیابی کا یقین کیا جاسکتا ہے۔

(۵)

ایک اور حملہ

۱۲ مئی ۱۹۷۰ء کو لبنان کے جنوبی حصہ پر حملہ کرکے اسرائیل نے اپنے قیام اور آزادی کی بائیسویں سالگرہ منائی ۔ لبنان پر اسرائیل کا یہ سب سے بڑا حملہ تھا جس میں ٹینک استعمال کئے گئے اور ہوائی فوج بھی حملہ آور ہوئی ۔ اس حملے کے دو بڑے مقصد تھے ۔ ایک مقصد فلسطینی فدائیوں کے مراکز کو تباہ کرنا تھا اور دوسرا مقصد عربوں کے اتحاد عمل کا اندازہ لگانا تھا ۔ جس تیزی سے جوابی حملے میں شام، عراق اور اردن نے تعاون کیا ہے اس سے اسرائیل بھی حیران ہے کیونکہ ۱۹۶۷ء کے بعد پہلی بار عربوں کا یہ اجتماعی حملہ تھا ۔ شام نے اسرائیل سے ملحق لبنان کی سرحد پر اپنی ساری توجہ مرکوز کردی جبکہ عراق اور اردن نے لبنان کے مشرقی حصوں کو سنبھالا ۔ متحدہ عرب جمہوریہ اس لڑائی میں شریک نہیں ہوا ۔ لیکن صدر ناصر نے اعلان کیا ہے کہ وہ سینائی میں جنوب کی طرف سے اسرائیل پر بری و فضائی دونوں طرح کا حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ صدر ناصر نے کھلم کھلا اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ MIG اور SAM میزائل کو چلانے کی ٹریننگ دینے کیلئے مصر نے روسی ہوابازوں کی خدمات حاصل کی ہیں ۔ اس نازک صورت حال میں روس کی موجودگی انسدادی اور اشتعالی دونوں قسم کے اقدام کا باعث بن سکتی ہے ۔ امریکہ کے صدر نکسن نے اعلان کیا ہے کہ وہ مغربی ایشیا میں اسرائیل کے خلاف فوجی توازن کسی طرح بگڑنے نہ دیں گے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ضرورت سمجھی گئی تو امریکہ اسرائیل کو "فینٹم جٹ" سپلائی کرے گا ۔ لیکن ساتھ ہی دونوں طاقتیں محتاط ہیں کہ لڑائی پھیلنے نہ پائے ۔ ایک انٹرویو میں صدر ناصر نے اعلان کیا کہ وہ اسرائیل کو نہر سویز میں اس شرط پر جہاز رانی کی اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ مقبوضہ علاقوں سے دست بردار ہوجائے ۔ ۱۲ مئی ۱۹۷۰ء کے اسرائیلی حملے کے متعلق سلامتی کونسل میں غور و فکر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مغربی ایشیا کی صورت حال سے تمام دنیا فکرمند ہے۔

سید غلام ربانی

دلی کی قدیم مسجدیں

اسلامی فن تعمیر میں مسجد ایک مقام رکھتی ہے، عقیدے کے لحاظ سے بھی اس کو اہمیت حاصل ہے۔ مسلمان اپنے عروج کے زمانے میں جہاں گئے وہاں سب سے پہلے انھوں نے مسجد بنائی۔ چنانچہ قطب الدین ایبک ابھی دلی میں تخت نشین نہیں ہوا تھا کہ اس نے مسجد قوت الاسلام کی بنیاد رکھی۔ یہ مسجد ایبک نے اپنے آقا محمد سام شہاب الدین (محمد غوری) کے حکم سے تعمیر کرائی، پانچ در سنگِ سرخ کے بنوائے اور شمالی دروازہ پر تعمیر شروع ہونے کی تاریخ کندہ کرائی۔

یہ عمارت تراشیدہ پتھروں سے بنی ہے اس کے دروں پر نفیس مبت کاری ہے۔ صحن کے ہر طرف سہ گجے دالان ہیں۔ پانچوں دروں پر کلام اللہ کی آیتیں اور حدیثیں کندہ ہیں۔ صحن کے بیچ میں لوہے کی لاٹھ ہے جو متھرا میں چھ سو برس سے قائم تھی۔ جب مسجد تیار ہوئی تو اس نے درودیوار پر سنہرے کلس چڑھوا دیے، اذان کے لئے قطب مینار کی تعمیر شروع کی، یہ کام بھی محمد غوری کے ایما سے ہوا۔

ہندوستان میں سنگ تراشی کا فن دو ہزار برس سے چلا آرہا تھا۔ یہاں کے کاریگر نقش و نگار اور مبت کاری میں کمال رکھتے تھے چنانچہ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر میں مقامی ہاتھ صاف نظر آتا ہے۔

مندروں کی بیرونی سطح پر پٹیاں بنانے کا رواج عام تھا، کہیں یہ پٹیاں عمودی ہوتی

ہیں کہیں افقی، قطب مینار میں یہ پٹیاں عمودی ہیں۔

مسلمان دروں کی محرابیں ڈاٹ کے اصول پر بناتے تھے۔ اس مسجد کی محرابیں ڈاٹ پر نہیں بنائی گئی ہیں بلکہ پتھروں کو افقی سلسلوں میں نصب کر کے اوپر کی جانب گھٹاتے چلے گئے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہاں مسلمان معماروں اور کاریگروں کی کمی تھی، تعمیری کام زبانی ہدایات پر ہوتا تھا چنانچہ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار ہندو مسلم طرز تعمیر کی طرف پہلا قدم تھا۔

قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش نے اس مسجد کو اور بڑھایا۔ شمال اور جنوب میں تین تین در اور بنوائے۔ چوتھے اور پانچویں درجے علاء الدین خلجی نے بنوانے شروع کئے مگر ادھورے رہ گئے۔ فیروز شاہ تغلق اپنی "فتوحات" میں لکھتا ہے:

"...... میں نے اس مسجد کی مرمت کرائی
اور اس کو نیا بنوا دیا ...."

اب گیارہ درجے موجود ہیں، جن میں سے تین بڑے اور آٹھ چھوٹے ہیں۔ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر سو برس سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ علم الآثار کے ماہر فرگسن نے لکھا ہے کہ

..... اس مسجد کی محرابوں کو اونچائی اور قطب مینار کے
سبب سے دنیا کے عجائبات میں شمار کرنا چاہیئے....."

خاندان خلجی کی عمر بہت کم رہی یعنی صرف تیس برس جیا۔ سلطان علاء الدین خلجی وسیع فتوحات میں لگا رہا۔ اس دور میں کوئی قابل ذکر مسجد نہیں بنی البتہ تغلقی دور میں نقشہ بدل گیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دارالحکومت فیروز آباد اور اس کے مضافات میں آٹھ جامع مسجدیں موجود تھیں، ان میں سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کھڑکی مسجد

موضع کھڑکی میں ست پلے کے پاس یہ مسجد ہے جس کو خان جہاں نے ۱۳۷۵ء میں

تعمیر کرایا[1]۔ یہ مسجد تہ خانہ پر بنی ہے جس سے کرسی بلند ہوگئی ہے تہ خانہ میں گاتھک طرز کی سنگین محرابیں قائم کرکے ان پر عمارت بنائی گئی۔ صحن کا بیشتر حصہ چھت سے ڈھکا ہوا ہے البتہ بیچ میں چار چھوٹے چھوٹے کھانے روشنی کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ چھت چار ربعوں میں تقسیم کی گئی ہے جن کے ہر طرف نو نو گنبدوں کے نو نو مجموعے ہیں، اس طرح پوری چھت ۹×۹ یعنی ۸۱ گنبدوں سے پٹی ہوئی ہے، ہر گنبد کے تلے چار چار ستون ہیں جن سے نچلا حصہ ستونوں کا جنگل نظر آتا ہے۔

مشرق اور جنوب میں دو دروازے ہیں، جن میں داخل ہونے کے لئے بہت سی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف دو مخروطی مینار پاکھوں میں پیوست ہیں۔ ادھر ادھر سات سات محرابیں اور کونوں پر برج بنے ہوئے ہیں۔ اس وضع کی مسجد ہندوستان میں کہیں نہیں ہے۔

کلاں مسجد یا کالی مسجد

یہ مسجد فیروز آباد میں ۱۳۸۷ء میں بنی تھی، اس شہر کی ویرانی کے بعد شاہجہاں آباد میں آگئی چنانچہ ترکمان دروازہ کے قریب موجود ہے یہ بھی تہ خانہ پر بنی ہے جس سے اس کی کرسی اتنی بلند ہوگئی ہے کہ دروازہ میں داخل ہونے کے لئے ۳۲ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ عمارت سہ گہی ہے اور ہر گہ میں پانچ پانچ در ہیں۔ یہ مسجد تغلق طرز کی بہت اچھی مثال ہے، وہی سلامی دار دیواریں دروازے کے دونوں طرف مخروطی مینار، چاروں کونوں پر زبردست برج، چار دیواری فصیل کی طرح مضبوط ہے۔ دور سے یہ مسجد عبادت گاہ تو نہیں اچھا خاصا قلعہ معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] سید احمد خاں نے اس کا سن تعمیر ۱۳۸۷ء لکھا ہے۔

کھڑکی کی مسجد کی طرح اس کا صحن بھی مسقف ہے یعنی گنبدوں کے ٹلاؤں سے ڈھکا ہوا ہے۔ پشتیاں کسی قدر چھوٹے مگر مضبوط بہت ہیں۔ یہ ستون دو دو اور بعض جگہ چار چار ایک ڈال کے پتھر کے ہیں۔ اس مسجد کے استحکام کا یہ عالم ہے کہ چھ سو موسم اس پر برس چکے ہیں مگر کہیں سے جنبش نہیں کھائی ہے۔

مسجد درگاہ حضرت نظام الدین اولیا

حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں مزار شریف سے چند گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت مسجد ہے جو جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا نچلا حصہ سنگ مرمر کا ہے۔ گنبد کی شکل نیم کروی ہے مگر شاندار ہے۔ بڑے دروازے کے ادھر ادھر اور اس کی چھت پر دو دو برج ہیں اس طرح ساری مسجد کے پانچ برج ہوئے۔ ان کا وزن تقسیم کرنے کے لئے مسجد کے اندر بکھرائی داٹیں (Squinch) بنائی گئی ہیں، ان محرابوں اور ہندسی اشکال سے اندرونی حصے میں رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔

مسجد کی پیشانی پر نسخ اور کوفی خط میں آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اس مسجد کا درمیانی حصہ علاءالدین خلجی کے بیٹے خضر خاں نے بنوایا ہے۔

فیروز شاہ لکھتا ہے:

"...... درگاہ نظام الدین میں جو جماعت خانہ ہے
اس کو نئے سرے سے میں نے بنوایا ہے[1]....."

خاندان تغلق کے آخری دنوں میں دلی پر ایک بلا نازل ہوئی۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے شہر پر حملہ کیا، ہزاروں آدمی قتل کیے، لوٹ میں مال وزر کے ساتھ یہاں کے کاریگروں، معماروں،

---

[1] فتوحات فیروزی

سنگ تراشوں اور پچیکاروں کو سمرقند لے گیا تاکہ اپنے دارالحکومت میں ایسی مسجد بنوائے جس کا جواب کسی ملک میں نہ ہو[1]۔

یہ شہر اس بری طرح برباد ہوا کہ مدتوں پنپ نہ سکا چنانچہ خاندان سادات اور لودھی کے حکمراں کوئی بڑا تعمیری کام نہ کرسکے۔ انھوں نے نہ شہر بسائے، نہ قلعے بنائے، نہ محل تعمیر کئے، مدرسے، ایوانات اور مسجدیں بھی نہیں بنوائیں البتہ مقبرے کم سے کم پچاس ضرور بنوائے ان سے متعلق چھوٹی چھوٹی مسجدیں بھی بنوائیں لیکن ایک مسجد ایسی خوبصورت بنی کہ آگے چل کر مسجدوں کے لئے ایک نمونہ بن گئی اس کا نام موٹھ کی مسجد ہے۔

موٹھ کی مسجد

مبارک پور کوٹلے سے تھوڑی دور آگے یہ مسجد ہے۔ اس مسجد میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو اس سے پہلے کی مسجدوں میں نہیں۔ عمارت وسیع ہے، اس کا دالان چالیس گز لمبا چوڑا ہے۔ زکار میں پانچ پانچ در کی خوش وضع محرابیں ہیں، چھت پر تین بڑے بڑے گنبد، قبلہ کی دیواریں مخروطی مینار، دروازوں کے حاشیے، عمارت کے دونوں پہلوؤں میں باہر نکلی ہوئی بالکنی، ان پر جھروکے، عقبی دیوار کے سروں پر دومنزلہ مینار ہیں جن میں خوبصورت نشیمن نکالے ہیں مسالا جو عمارت میں استعمال ہوا ہے، رنگین ہے۔ گنبد کے سہارے کے لئے نئے طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ اندر درمیانی حصہ میں بکھوائی ڈاٹیں، چونے میں نقش ونگار، پچی کاری کی جگہ پلاسٹر ہیں منبت کاری محرابوں کی پیشانی پر قرآنی آیات کے رنگین طغرے منبت کئے گئے ہیں جو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پرسی براؤن کا بیان ہے کہ یہاں کے صناع اور کاریگر وہی کام کر رہے تھے جو انہی دنوں الحمرہ (اسپین) کی دیواروں پر ہو رہا تھا۔

---

[1] ملفوظات تیموری

اس مسجد کے کنوئیں میں سنگ سرخ کا کتبہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسجد ۱۴۸۸ء میں سکندر لودھی کے عہد میں تعمیر ہوئی[1]۔

مسجد قلعہ کہنہ

یہ مسجد پرانے قلعہ میں شمال مشرقی فصیل کے پاس ہے۔ اس کو شیر شاہ نے ۱۵۴۱ء میں تعمیر کرایا۔ یہ عبادت گاہ بادشاہ اور اس کے خاندان کے لئے مخصوص تھی، اس عمارت کی بیرونی دیواروں پر بعض چیزیں بہت خوشنما ہیں۔ ہر طرف خوبصورت جھروکے ٹوڑوں پر قائم ہیں عقبی کونوں پر دو چھوٹے مگر مستحکم مینارے ہیں جن میں زینے بنے ہوئے ہیں لیکن باہر کا اصلی حسن اس کی روکار میں ہے۔ پانچ محرابی در ہیں، ہر محراب کے اندر ایک اور چھوٹی محراب ہے جو مستطیل چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے حاشیے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں روکار میں مختلف رنگوں نے رعنائی پیدا کر دی ہے۔ سنگ سرخ میں سنگ مرمر کی لوحیں بڑی صفائی سے بٹھائی گئی ہیں اس کے علاوہ رنگین پچی کاری بھی ہے۔ ان جمالیاتی اوصاف کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جو تاریخی روایات رکھتی ہیں مثلاً درمیانی ایوان کے دونوں پہلوؤں پر پتلے پتلے مینارے، کرکی وضع کے آرائشی حاشیے، جن کا خیال قطب مینار سے لیا گیا ہے۔ عقبی دیوار پر تغلق طرز کے مخروطی مینار، محراب کا بانکپن اور اس کی وضع جو آگے چل کر شاہجہانی محراب بن گئی۔

مسجد کا اندرونی حصہ بھی اعلیٰ درجے کی پیداوار ہے۔ پانچوں ایوانوں کا تناسب، محرابوں کی ترتیب اور ان کا سلسلہ، ان کے گرد حاشیے، قبلہ کی دیوار میں مہین چونے کے

---

[1] ایک روایت مشہور ہے کہ کسی شخص نے راہ چلتے زمین سے موٹھ کا دانہ اٹھالیا۔ اس کو بویا، اس میں خوشے لگے، پھر بویا اسی طرح چند سال میں بہت روپوں کی موٹھ ہوگئی اس سے یہ مسجد بنی۔

نقش ونگار، لداؤ کی چھت میں جدت یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ ان کے بنانے والوں کو اپنے اوپر اعتماد تھا۔ ماہرین نے چھت کی بہت تعریف کی ہے۔

دیواروں پر طاقوں کے سلسلے میں جو لداؤ کے اصول پر طاق در طاق بنائے گئے ہیں۔ بڑی محراب پر بیل بوٹے اور حاشیوں پر آیات قرآنی خط ثلث میں کندہ ہیں، ان چیزوں کو اس سلیقہ سے بنایا گیا ہے کہ Applied Art کی تصویر بن گئی ہے۔ اس مسجد کو اکبرنامے میں جامع مسجد لکھا ہے۔ سرسید احمد خاں کا خیال ہے کہ شاید ہمایوں کے وقت میں اس کو جامع مسجد ٹھیرادیا گیا ہو۔

مسجد جہاں نما یا جامع مسجد

جس دن شاہجہاں آباد میں لال قلعہ کا پہلا پتھر رکھا گیا، اس کے چھ سال بعد اس مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ شاہجہاں کے دیوان اعلیٰ سعد اللہ خاں کی نگرانی میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ روزانہ پانچ ہزار راج، مزدور، بیلدار، سنگ تراش اور پچی کار کام کرتے تھے پھر بھی چھ سال میں جاکر پوری ہوئی۔

عمارت سر سے پاؤں تک ایک رنگ کے سنگ سرخ کی ہے۔ تین طرف بلند سیڑھیاں ہیں جو اہرام مصری کی شکل کی ہیں، تین عالیشان دروازے، سامنے وسیع صحن، چاروں کونوں پر برج، شاندار محرابیں، دو بلند مینار اور تین بڑے بڑے گنبد عمارت میں عظمت پیدا کرتے ہیں۔ ہر شخص جو اس میں داخل ہوتا ہے اس کی عظمت سے متاثر ہوتا ہے اور اگر وہ مسلمان ہے تو چاہتا ہے کہ اس میں نماز پڑھے اور یہی اس کا مقصد ہے۔

اس مسجد کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موزونی اور تناسب بلا کا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں مقام پر اس چیز کی کمی رہ گئی یا فلاں جگہ پر یہ چیز زیادہ ہو گئی۔

روکار بہت خوشنما ہے۔ درمیانی بڑی محراب کے دونوں طرف پانچ پانچ محرابیں

ہیں، یہ سب محرابیں مرغول دار ہیں۔ ان کے اوپر سنگِ مرمر کی لوحوں میں سنگِ موسیٰ سے کتبے پچی کیے گئے ہیں جو صحن میں سے نقش و نگار معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے در پر یا ہادی بطور طغریٰ اور اور باقی دروں پر شاہ جہاں کا نام نامی اور مسجد کے اخراجات کا حال درج ہے۔

محرابوں کے سروں پر دو بلند مینار ہیں ان کی برجیاں سنگِ مرمر کی ہیں اور میناروں پر نیچے سے اوپر تک عمودی دھاریاں ہیں۔ اندر کی طرف سات محرابیں ہیں۔ دالان سہ گہا ہے جو چالیس ستونوں پر قائم ہے۔ فرش سنگِ مرمر کا ہے جس میں سنگِ موسیٰ کی پچی کاری سے مصلے بنے ہوئے ہیں۔ چھت پر تین شاندار گنبد ہیں جو نرے سنگِ مرمر کے ہیں ان پر کلس سے گردن تک سنگ موسیٰ کی کروی دھاریاں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ صحن کے ہر طرف دالان ہیں اور چاروں کونوں پر مرمریں برج ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پاکیزہ عمارت ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے خوبصورت مسجد ہے۔

مسجد فتح پوری

یہ مسجد چاندنی چوک کے ختم پر ہے، اس کو شاہ جہاں کی بیوی نواب فتح پوری بیگم نے ۱۶۴۹ء میں تعمیر کرایا۔ نیچے سے اوپر تک سنگ سرخ کی ہے۔ اندر تین تین در کے دالان در دالان ہیں۔ فرش سنگ مرمر کا ہے کونوں پر دونوں طرف مینار ہیں۔ صحن اچھا خاصا وسیع ہے اس میں سنگ سرخ کے چوکے بچھے ہوئے ہیں۔

مسجد اکبرآبادی

یہ مسجد فیض بازار میں ہے[1]۔ اس کو نواب اعزاز النسا بیگم نے

---

[1] اس مسجد کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ مسجد کی اصل جگہ وہ تھی جہاں اب نیتاجی سبھاش چندر بوس پارک ہے، جسے پہلے ایڈورڈ پارک کہتے تھے۔ جامعہ

۱۶۵۰ء[1] میں تعمیر کرایا۔ اعزاز النسا بیگم عرف اکبر آبادی بیگم شاہ جہاں کی بیوی تھی۔ فیض بازار اسی بیگم نے بنوایا تھا چنانچہ اس کا نام بھی اکبر آبادی بازار تھا۔ یہ مسجد سر سے پاؤں تک تمام سنگ سرخ کی ہے اس کے سات در ہیں۔ پیش طاق سنگ مرمر کے ہیں اس کی پچی کاری ہیں پر چین بڑی صفائی سے بٹھائے گئے ہیں۔ صحن پچاس گز لمبا اور ۲۵ گز چوڑا ہے جس کے گرد طالب علموں کے حجرے بنے ہوئے ہیں۔[2]

مسجد سرہندی

یہ مسجد لاہوری دروازہ کے پاس بنوائی گئی تھی۔ دروازہ تو غائب ہو گیا ہے مگر مسجد اب تک موجود ہے۔ صحن کا کچھ حصہ جلے میں آگیا ہے۔ عمارت گہرے رنگ کے سرخ پتھر کی ہے اس کو سرہندی بیگم نے ۱۶۵۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ بیگم بھی شاہ جہاں کی بیوی تھی۔ اس مسجد کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے کئی جگہ سے شکستہ ہے۔

موتی مسجد

اورنگ زیب کو تخت نشین ہوئے دو تین سال گزرے تھے کہ اس نے حکم دیا، قلعہ میں مسجد

---

[1] رمضان المبارک ۱۰۶۱ھ مطابق اگست ۱۶۵۰ء ـ جامعہ

[2] مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سید احمد شہیدؒ" میں اس مسجد کے بارے میں لکھا ہے: "اس (مسجد) پر ڈیڑھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے اور یہ دو برس میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی مسجد کا مسقف حصہ ترسٹھ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا، اس کے تین گنبد اور سات در تھے، مسقف حصے کے سامنے کی طرف دائیں بائیں دو خوبصورت اور بلند مینار تھے، ترسٹھ گز لمبا اور ترسٹھ گز چوڑا صحن تھا جو زمین سے تین گز اونچا تھا اور اس کے گرد تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا، صحن سے باہر سامنے کی طرف وضو کے لیے حوض تھا، اس کے دو طرف جانب سے مسجد میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں......" (صفحہ ۷۱) جامعہ

تعمیر کی جائے۔ چنانچہ ۱۶۵۹ء میں موتی مسجد تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد دیوان خاص کے پاس ہے، فرش سے کلس تک تمام سنگ مرمر کی ہے اور یہ مرمر اتنا اعلیٰ ہے کہ اس میں موتی کی سی آب ہے۔ محرابوں کی مرغولیں بہت خوشنا ہیں اور در و دیوار پر اعلیٰ قسم کی منبت کاری ہے ایسی منبت کاری قلعہ کی کسی عمارت میں نہیں۔ پرسی براون نے اس کی تصویر اپنی کتاب *Indian Architecture* کے سرورق پر دی ہے۔ شمالی ضلع میں ایک حجرہ ہے جو اورنگ زیب کے ورد و وظائف کے لئے مخصوص تھا۔

مسجد اورنگ آبادی

شہر میں پنجابی کٹرہ کے اندر یہ مسجد موجود ہے اس کو اورنگ زیب کی بیوی نواب اورنگ آبادی نے ۱۷۰۳ء میں بنوایا تھا۔ پوری عمارت سنگ سرخ کی ہے۔ صحن میں حوض ہے جس میں نہر سے پانی آتا تھا۔ اس کا صحن وسیع تھا مگر لوگوں نے اس کا بہت سا حصہ اپنے مکانوں میں ملالیا ہے۔

زینت المساجد

فیض بازار کے مشرق میں شہر پناہ کے قریب یہ مسجد ہے۔ اس کو اورنگ زیب کی بیٹی زینت النساء بیگم نے ۱۷۱۰ء میں تعمیر کرایا اور اپنے دفن کے لئے مجر بھی بنوایا تھا۔ عمارت تمام سنگ سرخ کی ہے۔ چھت پر تین برج سنگ مرمر کے ہیں جن پر سنگ موسیٰ کی دھاریاں ہیں دونوں سروں پر دو مینار ہیں جو اتنے بلند ہیں کہ میلوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ مسجد کے سات در ہیں جن میں حسب معمول درمیانی بڑا باقی چھوٹے ہیں اس کا صحن بہت وسیع ہے۔

کسی زمانہ میں یہ مسجد بہت آباد تھی، حضرت غوث علی شاہ پانی پتی جب دلی آتے تو اسی مسجد میں قیام کرتے تھے شام کو علماء اور مشائخ جمع ہوتے۔ مرزا غالب شام کو اکثر یہاں آتے اور اپنے ساتھ خوان بھی لاتے تھے۔ اب یہ مسجد مصلیوں کو ترستی ہے۔

زینت النساء بیگم کے مزار پر یہ شعر کندہ ہے:

مونسِ ما در لحد فضلِ خدا تنہا بس است

سایہ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

سنہری مسجد کوتوالی

یہ مسجد محمد شاہ کے عہد کی ہے، اس کو نواب روشن الدولہ ظفر خاں نے ۱۷۲۱ء میں تعمیر کرایا۔ اس کے برج اور کلسیاں سب سنہری ہیں۔ شاید اپنے خطاب روشن الدولہ کی مناسبت سے اس کو چمکدار بنوایا ہے۔ آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ اس کے بُرج شکستہ ہو گئے تھے، اس لئے روشن الدولہ نے اپنی دوسری مسجد کے برج اس پر چڑھادئے۔ نواب کی یہ دوسری مسجد فیض بازار کی پھول کی منڈی میں ہے۔

فخر المساجد

یہ مسجد کشمیری دروازہ کے پاس ہے، اس کو نواب شجاعت علی خاں کی بیوی فخر النساء بیگم نے بنوایا۔ یہ مسجد کچھ زیادہ بڑی نہیں مگر وضع میں لاجواب ہے۔ رو کار اس کی تمام سنگِ مرمر کی ہے جس میں جا بجا سنگ سُرخ کی دھاریاں ہیں۔ اس کے گنبد سنگِ مرمر کے ہیں، اندر کا فرش بھی مرمریں ہے صحن میں سنگ سُرخ کا فرش ہے۔ سید احمد خاں نے اس مسجد کی خوش وضعی کی بہت تعریف کی ہے۔ راقم نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ایک فرنگی سیاح کو دیکھا جو کینوس پر اس مسجد کی تصویر بنا رہا تھا۔ یہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے۔

موتی مسجد

یہ مسجد مہرولی میں قطب صاحب کی درگاہ کے پاس ہے۔ درگاہ سے اتنی قریب ہے کہ

ایک دیوار بیچ میں ہے، نرے سنگ مرمر کی ہے۔ فرش بھی سنگ مرمر کا ہے۔ اس میں سنگ موسیٰ کا لہریا ہے۔ مسجد کے تین در اور تین گنبد ہیں۔ کونوں پر دو مینار سنگ مرمر کے ہیں۔ اس مسجد کو شاہ عالم بہادر شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔

نئی دلی پرانی دلیوں پر آباد ہے۔ یہاں قدیم مسجدوں کی کمی نہیں، مسجد بیگم پور، مسجد کالو سرائے، مسجد جالی، مسجد خیر پور، مسجد درگاہ قطب صاحب، مسجد عیسیٰ خاں اور کئی مسجدیں ہیں جو معمولی نہیں مگر ہم نے ان مسجدوں کو لیا ہے جو فنی خصوصیات رکھتی ہیں یا تاریخی دلچسپی کی ہیں۔

اختر انصاری دہلوی

اردو افسانے پر مغرب کا اثر

اردو افسانے پر مغربی اثرات کے ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ خود اُردو افسانہ مغرب کی دین ہے اور یہ پوری صنف ہی مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ اردو کا قدیم نثری ادب داستان کے علاوہ قصہ نگاری کے کسی دوسرے اسلوب سے واقف نہیں تھا۔ ناول، ناولٹ، مختصر افسانہ اور طویل مختصر افسانہ وغیرہ وہ اسالیب ہیں جو پچھلے سو برسوں میں مغربی ادبیات کے زیر اثر ہی ہمارے یہاں رواج پذیر ہوئے۔

مختصر افسانے کے آغاز سے پہلے اردو میں قصہ نگاری کی تاریخ تین مختلف ادوار سے گزر چکی تھی۔ پہلا دور چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کا طویل زمانہ تھا جو دراصل اردو نثر کا دکنی دور تھا۔ اس دور میں طبع زاد قصوں کا پتا نہیں چلتا، اور صرف چند ترجمے سب رس اور طوطی نامہ جیسے قصوں کی شکل میں ہماری توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ دوسرا دور اٹھارویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں اردو نظم و نثر کا مرکز ثقل دکن سے شمالی ہندوستان منتقل ہوا جہاں فورٹ ولیم کالج میں اور کالج سے باہر قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں جو تقریباً سب داستانی انداز کی چیزیں تھیں۔ پھر اسی زمانے میں الف لیلہ، بوستانِ خیال، داستانِ امیر حمزہ اور اردو کی دوسری طویل داستانیں وجود میں آئیں جو سینکڑوں جلدوں پر مشتمل اور ہزاروں صفحات کو محیط ہیں۔ تیسرا دور انیسویں صدی کے نصف آخر سے عبارت تھا۔ اس دور میں قصہ نگاری

کی روایت داستان اور داستانی اسلوب سے منقطع ہوکر ناول نگاری کی منزل میں داخل ہوئی اور نذیر احمد، سرشار، شرر، انجم کسمنڈوی اور مرزا ہادی رسوا کے کارناموں میں مغربی ناول کی واقعیت، ارضیت، حقیقت نگاری اور سماجی مقصدیت نے اپنی اولین جھلکیاں دکھائیں۔ جدیدیت کے اسی سلسلے کی کڑی مختصر افسانہ تھا جس نے بیسویں صدی کے آغاز میں جنم لیا۔

اس نہایت مختصر اور سرسری تاریخی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں قصہ نگاری کے ضمن میں داستان اور داستانی اسلوب کی ایک روایت کم وبیش پانچ سو سال سے متداول تھی۔ وہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہی اور اُس کے بعد مغربی اثرات کے منہ کا نوالہ بن گئی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر مغربی اثرات کی در آمد اور یورش نہ ہوئی ہوتی تو اس روایت کا اگلا قدم کیا ہوتا اور اس کے ارتقار کی اگلی منزل کیا ہوتی۔ ادب کی تاریخ صرف اس حقیقت کی مظہر ہے کہ وہ روایت ختم ہوئی اور اس طرح ختم ہوئی کہ بالکل ناپید ہوکر رہ گئی۔ سیاسی تغیرات اور تہلکات کے جلو میں جو نئے علمی وادبی اور فکری وتہذیبی رجحانات ملک میں داخل ہوئے انھوں نے داستان کی روایت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے مغربی ادب سے پہلے ناول اور اس کے کچھ دنوں کے بعد مختصر افسانے کی صنف کو برآمد کیا گیا۔

اردو میں مختصر افسانے کی ایجاد کا سہرا پریم چند کے سر باندھا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ پریم چند سے پہلے ماسٹر پیارے لال کے قلم سے دو تین افسانے وجود میں آچکے تھے جن میں سے کم سے کم ایک افسانہ (من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ) ضرور ایسا تھا جو جدید مختصر افسانے کے فنی اوصاف سے متصف تھا۔ یہ شاید اردو کا پہلا مختصر افسانہ تھا۔ لیکن ماسٹر پیارے لعل یا ان کے افسانے کسی تحریک یا روایت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لیے لامحالہ پریم چند ہی اردو میں مختصر افسانے کے بانی خیال کیے گئے۔ علاوہ ازیں پریم چند سے پہلے نشتر اور کچھ اور طویل مختصر افسانے بھی لکھے جاچکے تھے، اور گو اُن

وقت اُن سب کو ناول کے ذیل میں شمار کیا گیا، لیکن در اصل وہ مختصر افسانے ہی کے قبیل کی چیزیں تھیں۔ پھر اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کوئی اہم یا دیرپا تحریک، خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی، تمدنی ہو یا معاشرتی، کبھی کسی ایک شخص کا کارنامہ نہیں ہوتی۔ کسی بھی قابل ذکر تاریخی تبدیلی کا سہرا کسی ایک شخص کے سر باندھنا اصولی طور پر غلط ہے۔ عصر آفریں شخصیتیں عصر آفریں ہونے سے پہلے یا عصر آفریں ہونے کے ساتھ عصری پیداوار بھی ہوتی ہیں۔ حالات واقعات کو متاثر یا منقلب کرنے والے اشخاص خود بھی حالات وواقعات کی تخلیق ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں زمانے کی تاریخی ضرورتیں اور تاریخی تقاضے اصل چیز ہیں، اور اشخاص وافراد مع اپنے کارناموں کے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں مختصر افسانے کو وجود میں لانے کا باعث پریم چند سے زیادہ ادب، زندگی اور زمانے کے مختلف عوامل ومحرکات تھے جن کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سب سے پہلی بات تو یہ کہ بیسویں صدی کے آغاز تک اردو قصہ نگاری کی روایت مذہبی قصوں، اخلاقی حکایتوں، طلسماتی داستانوں اور جدید الوضع ناولوں سے گزرتی ہوئی اس منزل میں داخل ہو چکی تھی جہاں مختصر افسانے کی پیدائش کوئی مستبعد اور دشوار بات نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اردو کے علاوہ بعض دوسری ہندوستانی زبانیں مختصر افسانے کے فن سے آشنا ہو چکی تھیں اور بنگالی زبان میں ٹیگور اور سرت چندر جیسے عظیم افسانہ نگار منظر عام پر آ چکے تھے۔ تیسری بات یہ کہ مغرب میں مختصر افسانہ نگاری کا فن پوری ایک صدی کے نشوو ارتقا کے بعد اب عروج وبالیدگی کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ واشنگٹن ارونگ، ہاتھورن، ایڈگر ایلن پو، چارلز ڈکنس، رابرٹ لوئی اسٹیونسن، اناطول فرانس، پال ہارویو، اور مارسل پراوست جیسی تابناک ادبی شخصیتوں کے گہوارۂ فن میں پرورش پانے کے بعد اب مغربی افسانہ اپنی تمام جاذبیتوں اور رعنائیوں سمیت، چیخوف اور موپساں کی عظیم شخصیتوں سے وابستہ ہو چکا تھا۔ چیخوف اور موپساں افسانے کی دنیا میں دو منارۂ نور تھے جن کی روشنی سے عالمی ادب کے بعید ترین

گوشے جگمگا رہے تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اردو کی دنیائے ادب اِس رنگ و نور کے فیضان سے یکسر محروم رہتی، خصوصاً اس لیے کہ اب ہندوستانی نوجوانوں کی جو نسلیں پروان چڑھ رہی تھیں وہ یکسر مغربی طرزِ تعلیم کی ساختہ و پرداختہ تھیں۔ اِس سلسلے میں چوتھی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ مغرب میں انفرادی اور اجتماعی زندگی انیسویں صدی کے سکون و خواب سے نکل کر بیسویں صدی کے ہیجان و اضطراب میں داخل ہو چکی تھی۔ ہر شعبۂ حیات اُس انتشار سے دوچار تھا جو آگے چل کر دو عظیم جنگوں کی بدولت ابھی اور شدید اور بحرانی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ داخلی طمانیت مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ ضیقِ فرصت کا احساس بتدریج بڑھ رہا تھا اور اس صورت حال کے ہوتے ہوئے مختصر افسانے کی مقبولیت کا غیر معمولی طور پر بڑھ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ ہندوستان اِس صورتِ حال سے ابھی اِس حد تک دوچار نہیں ہوا تھا۔ لیکن اِن اثرات سے بالکل بیگانہ بھی نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہوش رُبا واقعات کے بعد کم و بیش پچاس برس تک ہندوستانیوں کے ذہن و ضمیر اور اعصاب و قویٰ پر جو دہشت چھائی رہی اب بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان آہستہ آہستہ اُس کے اثر سے آزاد ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہو۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں نئی لرزشوں اور نئی تھرتھراہٹوں کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ادبیات کی دنیا بھی نئے رجحانات کی پذیرائی پر آمادہ اور نئے زمانے کی خوش آیند تبدیلیوں کو اپنے دامن میں جگہ دینے کے لئے مستعد نظر آتی تھی۔ اردو شعر و ادب نے جن نئے اسالیب، اصناف اور مناہج کے لیے اپنا آغوش وا کیا ان میں جدید مختصر افسانہ بھی تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ پریم چند کی رہنمایانہ کارگزاری مسلّم، لیکن مغربی اثرات نے جو تہذیبی پس منظر مہیا کیا اور ثقافتی عوامل بہم پہنچائے اُن کے بغیر یہ کارگزاری شاید ممکن نہ ہوتی۔ اور خلاصہ اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ اردو میں مختصر افسانہ تمام و کمال مغرب کی دین ہے اور مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس صنف نے اردو میں رائج ہونے کے بعد وقتاً فوقتاً مغرب

کے اثرات کو کس طرح اور کہاں تک اپنے دامن میں جگہ دی، تو یہ امر تو بالکل ظاہر ہے کہ پریم چند اور اُن کے معاصرین کے افسانوں پر یہ اثرات مخصوص طور پر نہیں بلکہ ایک سرسری اور عمومی انداز میں پائے جاتے ہیں۔ اردو افسانہ نگاری کے اس اولین دور کو ۱۹۰۷ء سے ۱۹۳۵ء تک کے زمانے پر حاوی خیال کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۷ء کی یہ اہمیت ہے کہ پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں چھپا اور ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" بھی اسی سال شائع ہوا۔ اِس دور کا خاتمہ ۱۹۳۵ء پر اس لیے ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ اردو افسانہ بھی عروج وارتقاء کی ایک نئی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب اس اولین دور کے افسانہ نگاروں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مترجمین کے علاوہ ان میں رومانی، نیم رومانی، مزاحیہ اور اصلاحی و مقصدی افسانہ نگاروں کے متعدد مختلف گروہ تھے۔ ان سب کی تخلیقات میں مغربی اثرات کی کارفرمائی صرف اس حد تک ملتی ہے کہ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے انداز میں مختصر افسانے کی صنف سے متعلق ہیں۔ اکثر افسانے تو جدید مختصر افسانے کی ہیئت اور خارجی تشکیل کے معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔ اِس کے برعکس قدیم داستانی رنگ کے اثرات کی ان میں کمی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کا نوزائیدہ افسانہ ایک مدت تک داستان اور داستانی فن کے عناصر سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اور اپنی پیدائش کے بعد کم و بیش تیس سال تک واضح اور شعوری قسم کے مغربی اثرات سے بیگانہ رہا۔

البتہ جب ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے ساتھ اردو افسانہ اپنے تاریخی ارتقاء کی دوسری منزل میں داخل ہوا تو اس میں اچانک ایک غیر معمولی نمو پذیری اور ایک عجیب و غریب حرکی توانائی کے آثار پیدا ہوئے، اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے، گویا ایک جست لگا کر، ادب و فن کے بام رفیع پر متمکن ہو گیا۔ اسی دور میں اردو کے وہ افسانے بھی وجود میں آئے جن کی فنی بلندی آج بھی ہمارے افسانوی ادب کے انتہائی عروج و کمال کی آخری حد ہے اور جن کو دنیا کے بہترین افسانوں کے مقابلے میں بلا تامل اور بے محابا پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ حیرت انگیز

فنی ترقی سراسر مغربی اثرات کی مرہون منت تھی۔ اول تو اس دور کے لکھنے والوں نے مغربی افسانے کے تکنیکی عناصر کی پیروی پر، اپنے پیش روؤں کے علی الرغم، بہت شعوری توجہ صرف کی، اور وحدت تاثر اور نقطۂ عروج اور افسانوی ڈرامائیت جیسے مسلمات کو سختی کے ساتھ ملحوظ رکھا، جس کی بنا پر اردو افسانہ داستانی روایت سے مکمل طور پر آزاد ہو کر صحیح معنوں میں مختصر افسانے کی ہیئت سے آراستہ ہوا۔ پھر ترقی پسند مصنفین نے ادب کی مارکسی تعبیر کی روشنی میں ترقی پسند افسانوی ادب کو پروان چڑھایا اور فن اور مقصد کے امتزاج کی اچھی سے اچھی مثالیں پیش کیں یہ تو اس دور کا حاوی رجحان تھا اور عالمی ادب کا قوی ترین دھارا جو ترقی پسندوں کی کوششوں سے اردو میں رائج و مقبول ہوا اور برگ و بار لایا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مغربی میلانات بھی کام کر رہے تھے۔ فرائیڈ کی تعلیمات نے تحلیل نفسی کے جس دبستان کی بنیاد ڈالی تھی اس نے بھی ہمارے بعض افسانہ نگاروں کو متاثر کیا اور نفسیاتی تجزیہ نگاری کے اصول پر بے شمار افسانے لکھے گئے۔ مغربی اثرات ہی کے تحت تاثراتی افسانے یا بے پلاٹ کی کہانیاں بھی لکھی گئیں اور یہ تکنیک اس قدر مقبول ہوئی کہ اردو افسانے کا ایک خاص اسکول قرار پائی۔ خاص خاص مغربی مصنفوں سے خاص خاص ذہن اثر پذیر ہوئے۔ چنانچہ اردو کے کتنے ہی لکھنے والوں نے ڈی ایچ لارنس، جیمز جوائس کافکا، ہنری جیمس، اور ورجینیا وولف کے افکار یا اسالیب کے زیر اثر افسانے لکھے اور ان مختلف میدانوں میں قابل ذکر فتوحات حاصل کیں۔

مدہوش بلگرامی

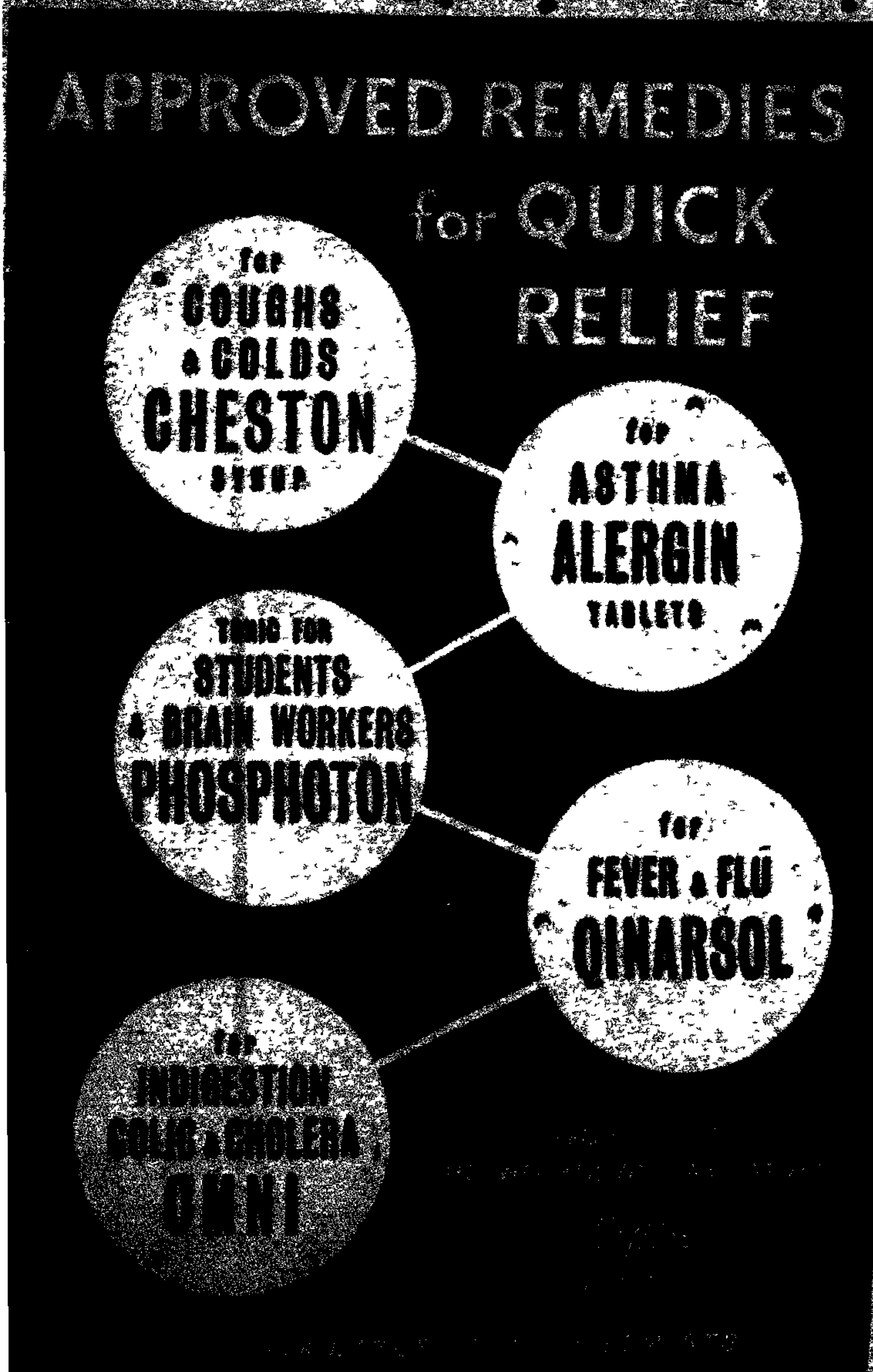
غزل

اُن کو اپنے قریب دیکھا تھا
ہائے کتنا حسین سپنا تھا
اپنے گلشن میں عکسِ رنگِ بہار
ہم نے بس ایک بار دیکھا تھا
میرا ساتھی وہ میرا راہ نما
جانے کن راستوں پہ بچھڑا تھا
زندگی کی اُداس راہوں میں
دور تک حسرتوں کا سایہ تھا
زندگی کا اتہ پتہ ہم نے
رک کے ہر ہر قدم پہ پوچھا تھا
گلستاں میں بہار آئی تھی
گلستاں پھر بھی ایک صحرا تھا
شاہراہوں کی بھیڑ میں مدہوش
میں وہ اک شخص تھا جو تنہا تھا


پھول کی طرح تروتازہ
اگر جلدی امراض یا فساد خون کی
شکایت ہو تو چہرہ پژمردہ نظر آتا ہے
خون صفا
پھوڑے پھنسی خارش اور داد سے نجات دے
کر جسم اور چہرے کو پھول کی طرح تروتازہ رکھتا ہے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ


صحت کا توازن...
جاڑوں میں ماء اللحم خاص کا استعمال
قوت و توانائی بخشتا ہے۔ اس کے صحت بخش
اجزا آپ کے رگ و پٹھوں میں سرایت
ہو کر نئی جان ڈالتے اور چستی پیدا کرتے ہیں۔
ماء اللحم خاص
غذائیت اور توانائی سے بھرپور بہترین ٹانک
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

The Monthly JAMIA
JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۲	بابت ماہ اگست ۱۹۷۰ء	شمارہ ۲

فہرست مضامین

مدیر
ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ :
رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون :
اڈیٹر : ۶۳۰۲۵۸
منیجر : ۶۳۰۴۹۰

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

عرصہ ہوا ایک ناول پڑھا تھا "اور انسان مرگیا" ناول پڑھ کر میرے اوپر یہ اثر نہیں ہوا تھا کہ انسان مرگیا ہے، ہاں وقتی طور پر کسی واقعہ سے متاثر ہوکر انسان کی انسانیت پر آدمی کا یقین متزلزل ہوجائے، یہ اور بات ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان نہ پہلے کبھی مرا تھا اور نہ آئندہ کبھی مرے گا، جب تک یہ کائنات اور اس کا کارخانہ قائم ہے، انسان باقی رہے گا، انسانیت باقی رہے گی، مرد وہ ہے جو حالات کے اندھیاروں سے ہراساں اور مایوس نہ ہو۔ ایک زاویے سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے انسان کے ہاتھوں بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ تاریخ انسانی خونیں ہنگاموں اور معرکہ آرائیوں کی تاریخ ہے، لیکن ایک اور نظر ہے، اس سے دیکھئے تو انسان انسان کا سہارا بنا ہے، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوا ہے، زندگی اس کے ہاتھوں حسین بنی ہے اور تہذیب و تمدن کے نشیمن ہائے روح افزا اور منازل دلکشا اسی کے مرہونِ منت ہیں۔

آپ نے شاعرِ مشرق کی ایک فارسی نظم بارہا پڑھی ہوگی، نظم کا عنوان ہے 'محاورہ مابین خدا و انسان' آج اس سلسلہ میں اِسے ایک بار پھر پڑھئے اور دیکھئے کہ حالات کی ناسازگاریوں کے باوجود زندہ رہنے اور کچھ کر جانے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے یا نہیں، خدا انسان سے کہتا ہے:

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان جواب میں کہتا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

معاصر حیات میں ضلع نینی تال کے ایک گاؤں کے ایک سابق فوجی چودھری نیپال سنگھ کا خط شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے جل گاؤں کی ہاجرہ کی دردناک کہانی سے متعلق اپنے قلبی تاثرات بیان کئے ہیں جن کے چاروں بچوں کو حالیہ فساد میں ان کی آنکھوں کے سامنے آگ میں جھونک دیا گیا۔ چودھری صاحب نے اپنے دل کا جو حال لکھا ہے اُس سے انسان کی انسانیت پر یقین اور پختہ ہو جاتا ہے اور آج کی زہرناکیوں کی تلخی بہت کم ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں ایک سابق فوجی ہوں۔ میں نے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک جنگ میں حصہ لیا اور بھاری توپ خانے کا رسالدار رہا۔ میں جاٹ ہندو ہوں اور میں نے توبروک، قاہرہ اور سسلی کی بڑی بڑی لڑائیوں میں حصہ لیا ہے، میری جوانی کا ہر لمحہ گولیاں چلانے میں گزرا۔ میں نے شہر کے شہر تباہ ہوتے اور ہزاروں انسانوں کو مرتے دیکھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے کئی ساتھیوں کو دفن کیا اور جلایا۔ لیکن اس پورے عرصہ میں کبھی میری آنکھ سے آنسو نہ نکلا، لیکن حیات میں ہاجرہ کی دردناک کہانی پڑھ کر میں بہت دیر تک روتا رہا۔ بہت کوشش کے باوجود میری آنکھوں سے آنسو تھم نہ سکے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دردناک واقعات نے میرے جیسے کئی فوجیوں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا...... حیات میں جل گاؤں اور بھیرٹی کے واقعات پڑھ کر بے حد رنج ہوا لیکن اس میں ہم سب کے لئے سبق بھی ہے کہ ہم سب ان فرقہ پرستوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینے کا تہیّہ کریں۔

بہن ہاجرہ بیگم کے لئے میں یہ کر سکتا ہوں کہ وہ میرے پاس آجائیں۔ میری بیوی اور بچے ان کی خدمت کر کے ان کا دکھ کم کرنے کی کوشش کریں گے اور میں اپنی آخری سانس تک ان کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

ہمارے ملک میں ایسے شریف النفس انسان بے شمار ہیں جن کے دل اس قسم کے واقعات پر تڑپ اٹھتے ہیں، بہتیرے خون خرابے، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات کے درمیان اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے مظلوموں کی مدد کرتے ہیں، ان کو پناہ دیتے ہیں، ظالموں کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس طرح انسانیت کو مرنے نہیں دیتے۔ احمد آباد، جابُاسہ، بھیڑی اور جل گاؤں کے فسادات میں کئی ہندو بھائیوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور حفاظت کی، مادر وطن کی روح ان کے کارناموں پر نازاں ہے، انسانیت کو ان پر فخر ہے، اور ہم بھارت کے نواسیوں پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنے دیس میں آدمیت کو زندہ رکھا۔

آج کل ہمارے ملک میں پیچھے کی طرف دیکھنے، دیکھتے رہنے اور لوٹ جانے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، یہ علامت ترقی کی نہیں ہے، جو کچھ ہو چکا وہ اب نہیں لوٹے گا، ہاں اُس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، بہت کچھ لے سکتے ہیں، اس لئے کبھی کبھی مُڑ کر پیچھے دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، اس کے فائدے بھی ہیں، لیکن ہمیں تیار رہنا ہے آنے والے زمانے کے لئے، دیکھنا ہے تو آگے کی طرف دیکھنا ہے، ہماری ساری کاوشیں، ساری جد وجہد ایک خوش آیند اور تابناک مستقبل کی تعمیر کے لئے ہونی چاہیئے۔ جماعتی زندگی ہو یا قومی زندگی، سب کا نصب العین یہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں امن وامان ہو اور قومی اتحاد و یک جہتی کے رجحان کو تقویت ملے۔ افسوس ہے کہ آج اتحاد اور قومی یکجہتی کے لئے جتنا کہا جاتا ہے انتشار اتنا ہی بڑھتا ہے، سوچنا چاہیئے کہ ایسا کیوں ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوم ابھی تک عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے تعصبات سے

نجات حاصل نہیں کرسکی ہے۔ سماج کا وہی پرانا ڈھانچا بڑی حد تک باقی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ شہروں کے وہ خاندان بھی جن کی معاشرت بالکل "موڈرن" ہے، ان تعصبات میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس طرح ہماری "موڈرن ازم" کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے وہ افراد جو پوجا پاٹ اور نماز روزہ کے قائل نہیں، معاشی مفاد کے پیش نظر مذہب، زبان یا ذات پات کے نام پر تعصب سے کام لیتے ہیں اور یہ دعویٰ بھی ہے کہ "ہم موڈرن ہیں اور ہر معاملہ میں "ریشنل نقطۂ نظر رکھتے ہیں"۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے یہ افراد آج ملک کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئے ہیں۔

انھیں افراد کا ایک گروہ ہے جو "نیشنلزم" کا نعرہ بڑے جوش سے لگاتا ہے اور اپنے آپ کو جمہوریت کا بھی علمبردار کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں عہد جدید کی پروردہ ہیں لیکن یہی گروہ ہے جو مذہب کے نام پر انسانوں کی تقسیم کو جائز قرار دیتا ہے، تہذیب اور زبان کے معاملہ میں رواداری اور انصاف سے کام نہیں لیتا اور ذات پات کے پرانے نظام کو باقی رکھنا چاہتا ہے، ایک طرف وہ صنعتی ترقی کا خواہاں ہے، یعنی ایک قدم آگے بڑھاتا ہے، تو دوسری طرف سماجی اعتبار سے وہ رجعت کا حامی ہے، یعنی اس کا دوسرا قدم پیچھے پڑتا ہے، اس طرح اس نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ نئی نسل کی ایک بڑی تعداد کو فکر و عمل کی ایسی الجھنوں میں ڈال دیا ہے کہ ملک و قوم کو شدید نقصان پہونچ رہا ہے۔ جو لوگ اس گروہ کی سرگرمیوں کے مُضر نتائج کا شعور رکھتے ہیں انھیں اپنے اپنے حلقے میں اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس گروہ کا اثر کم ہو، یہاں تک کہ زائل ہو جائے۔ آج سچی حب الوطنی کا یہی تقاضا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب

نئی دنیا پر ایک نئی نظر

عربوں اور اسرائیلیوں کی کشمکش کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انکرہ، فرینک فرٹ اور غالبًا دوسرے ہوائی اڈوں پر جب مسافر جہاز پر سوار ہونے کے لئے جاتے ہیں تو ان کے سامان کی بھی تلاشی لی جاتی ہے جو ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ انکرہ میں مجھ سے بھی اپنا بستر کھولنے کو کہا گیا، اور یہ مطالبہ ایسا نرالا تھا کہ تلاشی لینے والے کو تین بار کہنا پڑا، تب بات میری سمجھ میں آئی۔ پھر یاد آیا کہ انکرہ کے پین امریکن کے دفتر کے بڑے شاندار شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، اور یہی حال اس کے سامنے کے ایک امریکن بینک کا بھی تھا۔

ہوائی جہاز کے سفر کے اوقات اور انسانی جسم کے نظام میں ہم آہنگی اسی حالت میں ہو سکے گی جب بڑے سے بڑے فاصلے دو تین گھنٹوں میں طے ہو جایا کریں گے۔ آج کل تو صورت یہ ہے کہ آدمی انکرہ سے ساڑھے دس بجے صبح چل کر نیویارک ساڑھے سات بجے شام کو پہنچتا ہے، لیکن یہ گھڑی کا فریب ہے، انسانی جسم کہتا ہے کہ رات کے ساڑھے سات نہیں ساڑھے بارہ بجے ہیں، اور سرکاری قاعدوں کی پابندی اور ہوائی اڈے سے ہوٹل تک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد، اگر گھڑی کی بات مان جائے اور رات کا کھانا کھایا جائے تو ایک حساب کے مطابق بس سونے کا وقت آتا ہے اور دوسرے کے مطابق گذر چکا ہوتا ہے۔ مجھے زیادہ دیر اس وجہ سے بھی لگی کہ میں مس بلر کو جو مجھے ہوائی اڈے پر لینے آئی تھیں، پہچان نہ سکا۔ انھوں نے ایک پرچی بھوائی تھی، جو مجھے جہاز سے اترنے کے بعد ہی مل گئی، کہ مجھے لینے کے لئے مس بلر آئیں گی اور یا تو وہ لاؤنج میں

گی جہاں اسباب لاکر رکھا جاتا ہے یا پین امریکن کمپنی کے دفتر کے سامنے ۔ پہچان کے لئے بتایا گیا تھا کہ بال سنہرے اور اوور کوٹ بھورا ہے ۔ اسباب وصول کرنے کی جگہ پر ان شرطوں کو پوری کرنے والی کوئی خاتون نظر نہ آئیں تو میں پین امریکن کے دفتر کے پاس گیا ، ادھر ادھر دیکھا ، دفتر والوں سے پوچھا ، مگر ان کا پتہ نہ چلا ۔ پھر اس خیال سے کہ دفتر میں کام کرتی ہیں تو رعب داب والی ہوں گی میں نے دو خواتین سے جن کی عمر اور جسامت مناسب معلوم ہوتی تھی اور جو سنہرے بال اور بھورے اوور کوٹ کی شرط بھی پوری کرتی تھیں سوال کیا ، مگر ان میں سے کوئی مس طرز نہ نکلی ۔ اس دوران میں میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی سی گھوم رہی ہے اور پین امریکن کے دفتر میں لوگوں سے کچھ پوچھ رہی ہے ۔ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ مس طرز یہی ہیں ۔ بہر حال ، آدھے گھنٹے کے قریب انتظار کرنے کے بعد میں ٹیکسی لیکر ہوٹل پہنچ گیا ۔ یہاں آفاق میاں اپنے ایک دوست کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے ۔ ان سے مل کر بڑی خوشی اور تسلی ہوئی ، سامان لیکر کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ ہوٹل کے دفتر سے فون آیا کہ مس طرز آپ سے ملنے آئی ہیں ۔ نیچے جا کر دیکھا تو یہ وہی لڑکی سی تھیں جو ہوائی اڈے پر میرے سامنے مجھے تلاش کر رہی تھیں ۔ مس طرز نے مجھے میرے پورے سفر کا پروگرام دیا جو پہلے سے ٹائپ کیا ہوا تیار تھا ، کہ کس دن کہاں جانا ہوگا ، کون ہوائی اڈے پر مجھے لینے آئے گا اور میرے پروگرام پر عمل کرانے کا ذمہ دار ہوگا ۔ اس کے مطابق مجھے اگلے ہی دن ریل سے فلاڈلفیہ جانا تھا ۔ امریکہ میں آج کل ریلوے کمپنیوں کی حکومت سے اور پبلک سے ان بن ہو گئی ہے ، حکومت ہوائی جہاز کی کمپنیوں کو امداد دیتی ہے ، ریلوے کمپنیوں کو نہیں دیتی ، اگرچہ یہ بھی مسافروں کو لانے لے جانے کے کام میں نقصان پر چلتی ہیں ، پبلک ریلوے کمپنیوں کو بدنام کرتی رہتی ہے ، اور سفر کے ہر ذریعے کو ریل کی سواری پر ترجیح دیتی ہے ۔ اس کے جواب میں ریلوے کمپنیوں نے طے کیا ہے کہ وہ صرف مال کو لانے لیجانے کا کام کریں گی ، اور مسافروں کو ریل سے سفر کرنے سے روکنے کے لئے انھوں نے گاڑیوں کی صفائی اور مرمت اور وقت کی پابندی کا خیال کرنا چھوڑ دیا ہے ۔ لیکن نیویارک سے فلاڈلفیہ اور واشنگٹن جانے والی گاڑیاں پھر بھی صاف ستھری ہیں اور وقت سے چلتی ہیں ۔ میں وقت سے پہنچ گیا ، اور پلیٹ فارم

سے نکل کر اسٹیشن کے ہال میں آیا تو پروفیسر مسعود غزنوی، جو مجھے لینے آئے تھے، نظر آگئے۔ یہ پنجاب کے مشہور لیڈر داؤد غزنوی صاحب کے لڑکے ہیں، علی گڈھ کے پڑھے ہوئے ہیں، پنڈت نہرو سے ان کا چچا بھتیجے کا رشتہ تھا، کوئی دو سال ہوئے علی گڈھ اور جامعہ آچکے ہیں۔ مجھے یہ سب معلوم ہونا چاہیئے تھا، مگر ذہن کا وہ حصہ جس کے سپرد ایسی معلومات کو محفوظ رکھنا اور وقت پر پیش کر دینا ہے کبھی کارپرداز نہ تھا اور اب بیکار سا ہو گیا ہے۔ پھر بھی آنکھوں نے ہندوستانی شکل صورت پہچان لی، اور غزنوی صاحب بھی آگے بڑھ کر مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے کالج کی تین لڑکیوں کو ساتھ لایا ہوں کہ اسٹیشن سے باہر جانے کے ہر رستے کی ناکہ بندی کر لوں، مگر آگے بڑھے تو دیکھا کہ تینوں ایک دکان کے سامنے کھڑی چاکلیٹ کھا رہی ہیں۔ غزنوی صاحب نے تعارف کرایا، پھر سب باہر نکلے اور موٹر پر سوار ہو کر روزمونٹ کالج کے لئے روانہ ہو گئے۔

امریکہ میں یونیورسٹیوں کی کوئی حد نہیں، اور دولت کی فراوانی ایسی ہے کہ ہر قسم کے کورس پڑھائے جا سکتے ہیں۔ غزنوی صاحب روزمونٹ کالج میں ہندوستان کی تاریخ (عہدِ وسطیٰ) پڑھاتے ہیں، اور پاس ہی ٹمپل یونیورسٹی ہے جس میں اسلامیات کا ایک شعبہ ہے جس کے صدر ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی صاحب ہیں۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ جو لڑکیاں مجھے لینے آئی ہیں انھیں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا، غزنوی صاحب نے بتایا کہ وہ سب مسلمانوں کی تاریخ بڑی دلچسپی سے پڑھ رہی ہیں، ایک نقشبندی سلسلے پر مضمون لکھ رہی ہے، ایک تصوف پر۔ اس پر لڑکیوں نے ایک مسلمان استاد کا ذکر کیا جو کھانے پینے کے معاملے میں بہت تکلف کرتے تھے اور اپنی پرہیزگاری اور تقویٰ کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ غالباً ان کی اس عادت کا روزمونٹ کالج اور ٹمپل یونیورسٹی میں خاصا چرچا تھا اور لڑکیوں کو بہت لطف آیا جب میں نے پوچھا کہ یہ استاد پرہیزگاری اور تقویٰ کے بیان کے ساتھ یہ بھی بتایا کرتے تھے یا نہیں کہ مسلمان کو جھوٹ بولنا منع کیا گیا ہے۔

روزمونٹ کالج رومن کیتھلک فرقے کے لوگوں کا قائم کیا ہوا لڑکیوں کا کالج ہے، اور اس کے ہر چھوٹے بڑے کمرے میں ایک صلیب لٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کالج کی فضا میں مذہبیت کہیں

اور کسی شکل میں بھی نظر نہیں آتی۔ قیام کے دوسرے دن ایک لڑکی مسز سینڈرا شون فلٹ نے VOICE of AMERICA کی طرف سے میرا انٹرویو لیا، اور ایک استاد جون اسپوزٹو سے تعارف کرایا گیا جو شعبۂ دینیات میں پڑھاتے ہیں۔ شام کو یہ دونوں اس ہوٹل میں آئے جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا، گفتگو کے دوران لڑکی نے، جو روز مونٹ کالج میں پڑھ چکی تھی بتایا کہ وہ کچھ عرصہ تک نَن رہ چکی ہے، پھر دل میں کچھ ایسے شبہات پیدا ہوئے کہ اس نے یہ مسلک چھوڑ دیا اور شادی کرلی۔ استاد نے کہا کہ میں دس برس تک مُنک (MONK) تھا، پھر ایک لڑکی پر عاشق ہوگیا جو اب میری بیوی ہے۔ ان دونوں سے دیر تک مذہب اور تصوف پر باتیں ہوتی رہیں۔ شاید اسی گفتگو کا یہ نتیجہ تھا کہ سینڈرا شون فلٹ نے دوسرے دن مجھے سگار اور سگار کیس تحفہ کے طور پر پیش کیا اور اسپوزٹو نے مجھے فلاڈلفیہ کے ہوائی اڈے تک پہنچانا اپنے ذمہ لیا۔ کھانے پر غزنوی صاحب مارگریٹ کوپر کو لے آئے، جو کئی سال بمبئی میں رہ چکی ہیں اور حارث صاحب اور نورانی صاحب کو اچھی طرح جانتی ہیں۔

میں روز مونٹ کالج ۱۶ اپریل کو پہنچا تھا اور اسی شام کو غالب اور ایملی ڈکنسن پر لکچر تھا۔ جلسہ کی صدارت ٹمپل یونیورسٹی کے پروفیسر لیمبرٹ نے کی۔ اب اعلیٰ تعلیم میں مضامین کی کچھ ایسی تقسیم ہوگئی ہے کہ ایک کا دوسرے سے تعلق صرف اصولی طور پر مانا جاتا ہے، تاریخ کا ادب سے ہی نہیں، ایک ملک کی تاریخ کا دوسرے ملکوں کی تاریخ سے کوئی حقیقی رشتہ قائم نہیں کیا جاتا، اور انسانیت کے رشتے تو بالکل فرضی ہوتے ہیں۔ میں نے بھی غالب اور ایملی ڈکنسن پر ایک ساتھ بحث کرنے کا ارادہ صرف اس وجہ کیا تھا کہ مجھے دونوں بہت پسند ہیں۔ اس سفر کے دوران کہیں مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا غالب ایملی ڈکنسن کے بارے میں کچھ جانتے تھے؟" میں نے جواب دیا کہ "نہیں"۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا ایملی ڈکنسن غالب کے بارے میں کچھ جانتی تھیں؟" میں نے پھر جواب دیا کہ "نہیں، مگر میں دونوں کو جانتا ہوں۔" میرے اس جاننے سے کام نہ بنتا اگر اپنا مطلب بیان کرنے کی یہ ترکیب سمجھ میں نہ آئی ہوتی کہ وقت اور فاصلہ اور زبان کی رکاوٹوں کو نظر انداز کرکے یہ فرض کیا جائے کہ دہلی میں مشاعرہ ہوا ہے، غالب اور ایملی ڈکنسن نے اپنا کلام سنایا ہے، اور

مشاعرہ کے بعد میں دونوں سے الگ ملتا ہوں اور ایک سے دوسرے کے بارے میں گفتگو کرتا ہوں۔ یہ ترکیب بہت مناسب ثابت ہوئی، کہ اس سے دونوں شاعروں کے کلام پر اور مشرقی اور مغربی شاعری کی خصوصیات پر تبصرہ کرنے کا موقع نکل آیا۔ ظاہر ہے امریکہ میں پڑھے لکھے لوگ غالبؔ کے کلام سے کیا ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں، ایملی ڈکنسن کی دو چار نظمیں ثانوی مدرسوں کے نصاب میں شامل کی جاتی ہیں، اس لئے بیشتر لوگوں کو اس بیچاری کا نام ہی یاد رہ جاتا ہے۔ میں نے جہاں بھی یہ مضمون پڑھا لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی قومی عظمت کا ایک پہلو نمایاں کیا جا رہا ہے جس سے وہ واقف نہ تھے۔

۱۷ اپریل کو ایک جلسہ ہوا جس میں اعجاز احمد صاحب نے غالبؔ کی غزلیں اردو میں پڑھکر سنائیں اور ایک امریکن شاعر نے کچھ نظمیں پڑھیں جو غالبؔ کے ترجموں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ترجمے اعجاز احمد صاحب نے کئے ہیں۔ یہ نئے فیشن کے مطابق داڑھی اور لمبی زلفیں رکھتے ہیں، لباس میں بھی شعریت برتتے ہیں، میرے سامنے انھوں نے غالبؔ کی غزلیں زنانہ لہجے میں پڑھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ موزوں اور ناموزوں میں فرق نہیں کر سکتے ہیں۔ امریکن شاعروں کے لئے انھوں نے جو ترجمہ کیا ہوگا اس کی صحت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی موقع پر اردو اور فارسی جاننے والوں کے مجمع میں انھوں نے "ہم موحد ہیں....." کے بجائے "ہم موجد ہیں...." پڑھا اور اصرار کرتے رہے کہ یہی صحیح بھی ہے۔ بہرحال، وقت کسی طرح کٹ گیا۔

روز مونٹ کالج سے مجھے مونٹریول (کینیڈا) جانا تھا۔ یہاں میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر چارلز ایڈمز کا مہمان تھا۔ ان کی اور ان کی بیوی کی مہمان نوازی اور محبت بیان نہیں کی جا سکتی۔ انسٹی ٹیوٹ کی مالی حالت اب اچھی نہیں ہے اور طالب علموں میں پہلے کی طرح اب بھی ایسے لوگ ہیں جن کے ذہن صاف نہیں ہیں، انھیں یہ معلوم نہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور کیسے، اور اس وجہ سے بے چین رہتے ہیں۔ وہاں استادوں میں ہمیشہ ایک دو کٹر مذہبی اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ آج کل اس قبیلہ کی نمائندگی ایک ایرانی مجتہد کر رہے ہیں۔ میں نے انسٹی ٹیوٹ میں اپنا مضمون

"اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" جو دو حصوں میں ہے، پڑھا ـــــ انھوں نے ان پر جو اعتراض کئے وہ میری سمجھ میں نہیں آئے، اس لئے کہ یہ بات میرے خیال ہی میں نہیں آسکتی تھی کہ ان پر ایسے اعتراض کئے جا سکتے ہیں اور میں نے جو جواب دئے وہ انھیں قطعاً غلط معلوم ہوئے۔ پروفیسر عبدالرحمٰن بارکر بھی دینی معاملات میں بند ذہن کی مثال ہیں۔ علمی اعتبار سے میرا یہاں کا قیام خاصا بے سود اور بے مزہ رہا، ڈاکٹر اور مسز ایڈمز کی شفقت ہمیشہ یاد رہے گی۔

اگلی منزل شکاگو یونیورسٹی تھی۔ یہاں میزبان محمد نعیم صاحب تھے۔ یہ سنہ ۵۴ یا ۵۵ء میں دہلی کالج میں اردو کے لکچرر کی جگہ کے امیدوار تھے، مگر منتخب نہیں ہوئے۔ پھر یہ امریکہ پہنچ گئے، قریب گیارہ سال سے وہاں ہیں اور اب وہیں رہنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ شکاگو میں حمید احمد خاں صاحب سے ملاقات ہوئی جو میری طرح غالب پر تقریریں کرنے کے لئے بلائے گئے تھے۔ مجھے ان کی تعلیمی اور ادبی کارگزاریوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ دونوں میں وہ بہت ممتاز رہے ہیں اور غالباً میں اپنی ناواقفیت کو چھپا بھی نہ سکا۔

شکاگو یونیورسٹی بہت بڑی ہے، شہر بھی بہت بڑا ہے، مگر غنیمت یہ ہے کہ یونیورسٹی شہر کے ایک کونے میں ہے، اور وہاں آدمی نسبتاً سکون سے رہ سکتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم کیسی شکل صورت بنائے رکھتے ہیں، اور کسی محتسب سے ان کے لباس کے بارے میں رائے لی جاتی تو وہ کیا کہتا اس کا اندازہ شکاگو پہنچ کر ہوا۔ جو استاد وہاں رہتے ہیں وہ اس فضا کے عادی ہو گئے ہیں، اور عادت کس بات کی نہیں ہو سکتی، وہ اپنا تعلیمی اور علمی کام بھی شوق اور یک سوئی سے کر سکتے ہوں گے۔ میں زیادہ عرصہ تک رہتا تو شاید میں بھی انھیں کی طرح ہو جاتا، پہلا اثر تو یہ پڑا کہ اپنی قدامت پسندی اور بے مائگی اس تہذیب کے مقابلے میں کچھ بری نہیں۔

میرا شکاگو کا پروگرام پروفیسر فضل الرحمٰن صاحب کے ایک سیمینار میں شرکت سے شروع ہوا۔ اس کے بعد چند استادوں کے ساتھ لنچ تھا۔ یہاں آغا ایرج دہقان سے ملاقات ہوئی۔ وہ مصدق کے حامی اور ان کی وزارت کے زمانے میں خاصے ممتاز تھے، پھر اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے

ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور کچھ عرصہ تک خاصا ادبی کام کر کے گذر اوقات کرتے رہے۔ یہ سب مجھے ان سے بعد کو معلوم ہوا اور میں نے ان سے درخواست کی کہ اپنی سوانح حیات لکھ کر مجھے بھیجیں، رسالہ جامعہ کے لئے ان سے مضمون بھی مانگا ہے۔ پہلی ملاقات میں تو میں نے ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی فارسی اور ان کے مذاق کے اختلاف کا ذکر چھیڑا، اور ان سے فرمائش کی کہ حافظ کی کوئی غزل جو انھیں پسند ہو سنائیں، انھوں نے ایک غزل سنائی اور پھر اپنے کہے ہوئے دو شعر:

شکست عہد من وگفت ہرچہ بود گذشت
بگریہ گفتمش آرے دلے چہ زود گذشت

بہار بود و تو بودی و عشق بود و امید
بہار رفت و تو رفتی و ہرچہ بود گذشت

سہ پہر کو حمید احمد خاں کا نوجوان غالب پر لکچر تھا۔ غالب کے اس دور کے کلام میں جو کچھ مجھے پسند ہے اس کا ذکر ان کے لکچر میں نہیں تھا، جو مثالیں انھوں نے دیں وہ میرے نزدیک مثالیں نہیں تھیں۔ مطبوعہ کلام کا ایک شعر:

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

میرے خیال میں شعر کہلانے کے قابل نہیں ہے، اس پر انھوں نے تفصیل سے تبصرہ کیا۔ لیکن ذوق کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے، میں نے اس وقت اور اس کے بعد کبھی غالب کے بارے میں ان سے گفتگو نہیں کی۔

نعیم صاحب نے طے کیا تھا کہ میرے لکچر کا موضوع "اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" ہوگا۔ میک گل یونیورسٹی میں میں نے محسوس کیا تھا، اور ڈاکٹر ایڈمز نے بتایا بھی کہ میری نظر ہندوستانی حالات پر تھی، پورے عالم اسلام پر نہ تھی، اس لئے یہاں میں نے دو لکچروں کو ملا کر ایک کر دیا۔ لکچر سے پہلے مجھے پروفیسر فضل الرحمٰن صاحب کا ایک مضمون پڑھنے کو مل گیا تھا اور میں نے بات اس پر ختم کی کہ میرے عقیدے

وہی ہیں جو فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کئے ہیں مگر مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان کے اپنے عقیدے بھی ہیں۔ فضل الرحمٰن صاحب جلسے میں موجود نہیں تھے، مگر کسی نے یہ بات ان تک پہنچادی اور انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیوں ان کے عقیدے پر شبہ کیا۔ میں ان کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ میں نے اس اطمینان کے ساتھ معذرت کر لی کہ ان کا دین ان کے علم میں گھُل کر غائب نہیں ہو گیا ہے۔

۲۵ر اپریل کو نیویارک واپسی ہوئی اور ۲۶ر کو ڈاکٹر اور مسز سید اور میرا بھانجا عمران اس کی بیوی سلمیٰ اور بچہ شاہد، آفاق اور مس بلڑ سب میرے ہوٹل میں جمع ہوئے، پھر ایک جگہ ساتھ کھانا کھایا اور نیویارک کے سنٹرل پارک میں سیر کے لئے گئے۔ اتوار کا دن تھا، پارک میں بہت سے لوگ سیر کے لئے آئے تھے، اور معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک مرد عورت نے اس موقع کے لئے ایک نیا فیشن نکالا ہے۔ میں بار بار مس بلڑ سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ مرد یا یہ عورت ہپّی ہے اور ہر دفعہ جواب ملتا تھا کہ نہیں، یہ معمولی امریکن شہری ہے۔ یہ جواب سنتے سنتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ منظر امریکن قوم کے نوخیز ہونے کا ثبوت ہے، اور اس کی تہذیب اور سیاست کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس بچپن کو اس معقولیت سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے جو امریکہ کی صنعتی ترقی اور سماجی اور کاروباری نظام میں ہر طرف نظر آتی ہے اور جس نے امریکہ کو اس قابل بنادیا ہے کہ "آزاد" دنیا کی سیاسی قیادت کو اپنا منصب سمجھے۔

۲۷ر اپریل کی سہ پہر کو نیویارک کی مشہور کولمبیا یونیورسٹی میں "سیمینار" ہوا۔ یہ ایک عجیب تماشا تھا۔ دونوں فاضل مقرروں کے علاوہ ایک ہندوستانی، ایک امریکن اور دو ایرانی استاد اور دو ایرانی لڑکیاں تھیں۔ موضوع تھا ہندوستان اور ایران کے تعلقات، اور اس سلسلہ میں غالبؔ کا بھی ذکر آگیا۔ ۲۸ر اپریل کو ایشیا سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک ریسپشن ہوا اور اس کے بعد حمید احمد خاں صاحب نے غالبؔ پر اور میں نے غالبؔ اور ایمیلی ڈکنسن پر مضمون پڑھے۔ اس جلسے کی رپورٹ امریکن رپورٹر میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ رپورٹ ایک خاتون نے مرتب کی تھی جنھوں

نے جلسے سے دو روز پہلے میرا انٹرویو بھی لیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی رپورٹ نیویارک کے اخبارو
میں بھی چھپے گی؟ انھوں نے کہا کہ میں جو کچھ لکھتی ہوں وہ صرف امریکہ کے باہر کے امریکن اخبارو
میں چھپ سکتا ہے، ملک کے اندر میں کسی اخبار کے لئے نہیں لکھ سکتی۔ اس لئے معلوم نہیں کہ
نیویارک کے اخباروں میں کسی نے اس جلسے کا نوٹس لیا یا نہیں، اور لیا بھی ہوتا تو مجھے پتہ نہ چلتا،
مجھے صبح سویرے ایک دن کے لئے ڈیوک یونیورسٹی جانا تھا۔

یہ یونیورسٹی شمالی کیرولائنہ اسٹیٹ میں ہے، اسے حکومت سے تھوڑی بہت امداد ملتی ہوگی
لگر اس کا شمار پرائیویٹ یعنی غیر سرکاری یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کے وائس چانسلر کو چانسلر کہتے
ہیں۔ اس کا کیمپس شہر سے دور بہت پرفضا مقام پر ہے، تعلیم گاہ کے لئے جو کچھ چاہیے وہ فراوانی
کے ساتھ موجود ہے، تعلیم کے بہت سے شعبے ہیں، یہاں تک کہ ہندی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ شکاگو
ونیورسٹی میں بھی ہندی پڑھائی جاتی ہے، استاد پنجابی ہیں، اور ان سے ملتے ہی میں نے پوچھا کہ
ٓپ ہندی کس نسبت سے پڑھاتے ہیں، آپ کو تو اردو کی تعلیم دینا چاہئے۔ وہ خود بھی کچھ خوش
ہیں ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ میں ہندی تو پڑھاتا ہوں، مگر یہ بھی بتاتا رہتا ہوں کہ یہ زبان پڑھی
ور لکھی جاتی ہے، بولی نہیں جاتی۔ ڈیوک یونیورسٹی میں بھی ہندی کے استاد پنجابی ہیں، میرے سوال
ا انھوں نے اسی طرح کا جواب دیا۔ مگر یہ تو بعد کی بات ہے۔ میں تو پروفیسر اینزلی ایمبری کی محبت
ا گرفتار تھا۔ غالباً ڈیوک یونیورسٹی کا پروگرام انھیں کے اصرار پر رکھا گیا تھا۔ وہ مجھے صبح ہوائی اڈے
ر لینے آئے، ناشتہ خود تیار کر کے کھلایا، اس لئے کہ اکیلے رہتے ہیں، پھر یونیورسٹی لے گئے، وہاں
انسلر گوڈمین سے ملایا، جو دکھانے کو تھا دکھایا، پھر اپنے کلاس میں لکچر کرایا۔ ہندی کے استاد سے
نچ پر ملاقات ہوئی تھی۔ شام کو ایک کلب میں، جو انٹرنیشنل سنٹر بھی کہلاتا ہے، میری غالب پر تقریر
وئی۔ اس کی دعوت یونیورسٹی اور آس پاس کے کارخانوں اور ریسرچ کے اداروں میں کام کرنے
الے ہندوستانیوں کی طرف سے دی گئی تھی، اور جلسے میں ہندوستانی اور پاکستانی ہی تھے۔
ن کے بعد میں ایک دعوت میں شریک ہوا جو ایک سابق ہندوستانی کی طرف سے دی گئی تھی۔

یہاں مہمانوں میں سفید چوڑی دار پائجامہ، چکن کا کرتا پہنے اور دوپٹہ ڈالے ہوئے ایک نوجوان خاتون تھیں جنھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ میرے نام اردو میں خط آیا ہے، وہ مجھے پڑھ کر سنا دیجئے۔ خط کے القاب تھے "میری پیاری گڑیا" اور لکھنے والی تھیں لکھنؤ کی ایک خاتون جن کے شوہر اس "گڑیا" کو ستار بجانا سکھاتے تھے۔ خط سنانے کے بعد میں نے سوال کئے تو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان خاتون، مسز چرچ، اپنے شوہر کے ساتھ دو برس لکھنؤ میں رہ چکی ہیں، اردو سیکھی تھی مگر اب بھولتی جاری ہیں، اور دل کی سب سے بڑی آرزو ہے کہ پھر لکھنؤ جائیں۔ ایک طرف یہ آرزو تھی اور دوسری طرف میزبان تھے جو امریکن شہری بن چکے ہیں، امریکن بیوی کے ساتھ امریکن طریقے پر رہتے ہیں اور ہندوستان واپس جانے کی خواہش نہیں رکھتے۔

ڈیوک یونیورسٹی امریکہ کی ممتاز تعلیم گاہوں میں نہیں ہے، ہارورڈ یونیورسٹی ساری دنیا میں مشہور ہے، مگر وہاں پہنچ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہاں علمی اور تعلیمی کام ہوتا ہے اور ہو بھی سکتا ہے۔ مجھے عابداللہ غازی صاحب ایک امریکن دوست کے ساتھ لینے آئے تھے، ہوٹل پہنچ کر میں نے کہا کہ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا ہیں، بازار لے چلئے بازار کا مرکز ایک چوراہا ہے جسے ہارورڈ اسکویر کہتے ہیں۔ یہاں شاذ ہی کوئی صورت نظر آتی تھی جس پر وحشت یا وحشت زدگی کا کچھ اثر نہ ہو، اور لباس صورت کے مناسب تھا۔ غازی صاحب نے بتایا کہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں بہت کم ہے، چوراہے پر رونق شام کو ہوتی ہے، اس وقت آئیے گا۔

ہارورڈ یونیورسٹی کو دُرّانی فاؤنڈیشن اور یونسکو کی طرف سے صرف غالبؔ اور میرؔ پر نہیں بلکہ ہندوستانی اور ایرانی شاعری کے پورے سلسلے پر تحقیق اور کتابیں لکھنے کا کام سپرد ہوا ہے۔ اپنی مصروفیت کے باوجود پروفیسر شِمل نے، جو اس سارے کام کی نگراں اور ذمہ دار ہیں، مجھ سے تفصیلی ملاقات کے لئے وقت نکالا۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہ خود غالبؔ کے اردو اور فارسی کلام پر لکچر دیتی ہیں، غالبؔ کے منتخب کلام کا جرمن میں ترجمہ کر چکی ہیں جو جلد شائع ہونے والا ہے، اور اب تک انھوں نے غالبؔ پر جو مضمون لکھے ہیں انھیں یکجا کرکے چھاپنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

داؤد رہبر صاحب غالب کے تمام خطوط کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، اور ایک صاحب ابوطالب کلیم پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر شِمل کو موسیقی کا بھی شوق ہے، اور انھوں نے ایک ستار یے محمود مرزا کو ہارورڈ بلانے اور امیر خسرو کے فن موسیقی پر کام کرنے کا انتظام کیا ہے۔ ویسے ہارورڈ کی فضا پروفیسر شِمل کو بھی پسند نہیں اور سال میں چھ مہینے وہ اپنی یونیورسٹی بون میں جاکر رہتی اور پڑھاتی ہیں۔ مگر انھوں نے کہا کہ ہارورڈ کی زندگی بھی لطف سے خالی نہیں۔ میرا ایک طالب علم تھا جو ہر روز کسی ایک رنگ کے کپڑے پہن کر آتا تھا، کسی دن سب گلابی، کسی دن سب نیلے، کسی دن سب زرد۔ میں نے اس سے کہا کہ شاید تم اپنے لباس کے ذریعہ مصور پکاسو کے ہر دور کے طرز کی مثالیں پیش کر رہے ہو۔ یہ بات اسے پسند آئی اور وہ میرا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ اپنی بلی مجھے تحفے کے طور پر دینا چاہتا تھا، اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ میں نے بلی پالی ہے۔

امریکہ میں موٹر پر ڈیڑھ دو سو میل جانا کوئی بڑی بات نہیں، اس لئے مجھے ڈاکٹر ایورٹ ووڈمین نے، جو ہارورڈ سے قریب سو میل کے فاصلے پر ایک کالج کے پرنسپل ہیں، اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور میں نے اسے قبول کرلیا۔ ان کے کالج کا نام کولبی ہے، اور اس کا مقصد دولت مند گھرانوں کی لڑکیوں کی تعلیم ہے۔ روزمونٹ کالج کی طرح یہ بھی مذہبی لوگوں کا قائم کیا ہوا ادارہ ہے، یہاں بھی ایک گرجا ہے جس میں عبادت کے لئے اجتماع ہوتے رہتے ہیں، ہر قسم کے تعلیمی سامان کی فراوانی ہے، مذہبیت کے آثار ذرا بھی نہیں ہیں۔ مکان پر لنچ سے کچھ پہلے ڈاکٹر ووڈمین کے پاس ٹیلیفون آیا اور انھوں نے ذرا غصہ میں جواب دئے۔ میں نے سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ چند دن ہوئے میں نے یہاں تقریر کی تھی، ایسے معاملوں پر جن کا تعلق صرف مجھ سے اور کالج کی لڑکیوں سے ہے، اور والدین تقریر کی نقلیں مانگ رہے ہیں۔ میں نے کہدیا ہے کہ میں نقل کسی کو نہیں دوں گا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے مجھ کو تقریر کی نقل دی اور کہا کہ اسے کسی وقت پڑھ لیجئے گا۔ کولبی کالج سے واپسی کے وقت میں نے تقریر پڑھی۔ معلوم ہوا کہ زیر بحث یہ مسئلہ ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کو بلائیں تو انھیں کتنی دیر ٹھہرنے کی اجازت ہو۔ اس وقت انھیں صبح سے بارہ بجے رات

تک ٹھہرنے کی اجازت ہے، لیکن امریکہ کے بعض ترقی پسند لڑکیوں کے کالج ہیں، جہاں چوبیس گھنٹے ٹھہرنے کی اجازت ہے، اور کوبی کالج کی لڑکیوں کا مطالبہ تھا کہ ان کے لئے بھی یہی "قاعدہ" منظور کر لیا جائے۔ اس پر کالج کے منتظموں اور والدین کے اور لڑکیوں کے نمائندوں میں گفتگو ہوئی۔ لڑکیاں اپنی بات پر اڑی رہیں اور ڈاکٹر وڈمین کی تقریر سے معلوم ہوتا تھا کہ لڑکیوں کا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔ تقریر میں ڈاکٹر وڈمین نے کہا تھا کہ جو لڑکیاں ایسی آزادی چاہتی ہیں انھیں اپنا اعتبار بھی قائم رکھنا چاہئے، اس وقت صورت یہ ہے کہ دوکاندار شکایت کرتے ہیں کہ لڑکیاں دکانوں سے چیزیں چرا لاتی ہیں اور کمروں میں چھپ کر شراب پی جاتی ہے۔

ہارورڈ سے مجھے میچگین یونیورسٹی جانا تھا، جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نائب صدارت کے آخری زمانے میں ایک اہم تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ یہ یونیورسٹی ایک چھوٹے سے شہر این آربر میں ہے، اور شہر پر چھائی ہوئی ہے۔ یہاں میرے پروگرام کے ذمہ دار پروفیسر پارک تھے جو ہندوستان میں کئی سال ایشیا فاؤنڈیشن کے نمائندے کی حیثیت سے رہ چکے ہیں، اور ایسے بے عذر خیر خواہ ہیں کہ کلکتے کے موسم کی بھی تعریف کرتے ہیں اس لئے کہ وہاں انھیں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ پروفیسر پارک کے ہم خیال پروفیسر اگیرٹ سن شعبۂ تعلیم میں کام کرتے ہیں اور ان کی کوشش سے میچگین اور بڑودا یونیورسٹی نے مشترک طور پر تعلیمات کا ایک ریسرچ کا ادارہ قائم کیا تھا۔ دونوں اپنی جگہ موجودہ صورت حال پر بہت افسوس کر رہے تھے۔ ایشیا فاؤنڈیشن کا کام حکومت ہند نے بند کر دیا، اس لئے کہ اسے سی آئی اے (CIA) سے مدد ملتی تھی، بڑودا یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات کے ڈین نے میچگین یونیورسٹی، یعنی پروفیسر اگرٹ سن کو بتائے بغیر اپنی طرف سے اسی کام کے متعلق جو مشترک طور پر ہو رہا تھا یو جی سی میں ایک تجویز پیش کر دی جو منظور ہو گئی تو وہ کام جو مشترک طور پر ہو رہا ہے بند ہو جائے گا۔ پروفیسر اگیرٹ سن کو شبہ تھا کہ ڈین نے اپنی تجویز اس لئے پیش کی ہے کہ اس طرح انھیں نگرانی کے دو سو روپے ماہوار ملا کریں گے، اور اسی کا انھیں اور رنج تھا۔ پروفیسر پارک اور اگرٹ سن دونوں ہندوستانی طالب علموں کو داخل کرنے اور

انھیں وظیفہ وغیرہ دلوانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور ان کوششوں سے انھیں سُکھ سے کہیں زیادہ ان طالب علموں کی خود غرضی اور بیجا مطالبوں سے دکھ پہنچا ہے جن کی وہ مدد کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ میری اس رائے کو ماننے پر تیار نہیں تھے کہ امداد کا سلسلہ بند کر دینا چاہئے، اس لئے کہ یہ کسی ملک کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ دوسرے کسی ملک کا دست نگر ہو۔ کسی کے دل کا حال معلوم نہیں ہوتا، مگر ان دونوں کی باتوں کا میرے اوپر یہ اثر ہوا کہ دونوں اپنی طبیعت سے مجبور ہیں، جہاں تک ہو سکے گا امداد اور اشتراک عمل کی کوشش کرتے رہیں گے۔

میں جہاں بھی گیا جامعہ ملیہ کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں ضرور آیا۔ پروفیسر اگربٹ سن کو جامعہ سے اتنی دلچسپی ہے کہ انھوں نے مجھ سے اپنے اسٹاف کے جلسے میں جامعہ پر تقریر کرائی۔ یہ لوگ سب ہندوستان میں رہ چکے ہیں، مگر مہاراشٹرا اور گجرات میں، جامعہ کے کام کو دیکھنے کا موقع کسی کو نہیں ملا ہے۔ غالب کی یادگار منانے کے سلسلے میں میری غالب اور ایمیلی ڈکنسن پر تقریر ہوئی۔ جلسے کے بعد رات کے کھانے پر ایک خاتون نے مجھ سے کہا کہ میں نے ایمیلی ڈکنسن کی چند نظمیں ثانوی کے ادب کے نصاب میں پڑھی تھیں، آپ کی تقریر کے بعد میں نے اس نصاب کو پھر دیکھا، اور بہت غصہ آیا کہ ایسے اعلیٰ شاعر کی حیثیت غلط انتخاب کی وجہ سے طالب علموں کی نظروں میں گرائی جاتی ہے۔ پروفیسر بروم فیلڈ نے، جو جنوبی ایشیا کی تاریخ پڑھاتے ہیں، دوسرے دن مجھے ایمیلی ڈکنسن کی نظموں کا ایک باتصویر انتخاب، جو حال میں چھپا ہے، تحفے کے طور پر دیا۔

اس پورے سفر میں نوجوانوں کے جوش کے سب سے دلچسپ مظاہرے کارلٹن کالج میں دیکھنے کو ملے۔ یہاں تعلیم مخلوط ہے، اور اس سال فروری میں لڑکوں لڑکیوں کے آزادی اور ترقی پسندی کے شوق نے منتظموں کو اس پر مجبور کیا کہ مخصوص ہوسٹلوں کے علاوہ مخلوط ہوسٹل بھی قائم کئے جائیں، اور اب چند ہوسٹل ایسے ہیں جن میں لڑکے لڑکیاں ساتھ رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ پروفیسر ہیتھ کوکس نے، جو میرے میزبان تھے، کہا کہ امریکہ میں اب خاندانی اور سماجی زندگی ایسی ہو گئی ہے اور تعلیمی اداروں کی فضا ایسی ہے کہ بہت سے نوجوانوں میں محرومی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے،

یعنی وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس دنیا میں ان کا کوئی نہیں ہے اور وہ کسی کے نہیں ہیں، اور اگر یہ احساس زیادہ شدید ہو جائے تو اس سے طبیعت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ مخلوط ہوسٹل اس کا امکان پیدا کر دیتے ہیں کہ لڑکے لڑکیاں بھائی بہن کی طرح رہیں، اور کسی کو تنہائی کا نقصان دہ احساس نہ ہو۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ اب تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ مخلوط ہوسٹل قائم کرنے کا فیصلہ غلط تھا۔ دوسری طرف کارلٹن کالج کی میگزین میں میں نے ایک ماہر نفسیات کا مضمون دیکھا جس میں یہ دعویٰ تھا کہ لڑکوں لڑکیوں کا اس طرح ساتھ رہنا انھیں ایک دوسرے کا محرم بنا دیتا ہے اور ان کی طبیعتیں خود بخود اپنے اوپر وہ پابندیاں لگا لیتی ہیں جو قدیم زمانے سے محرموں کے تعلقات پر لگتی رہی ہیں۔ انگریزی میں اس پابندی کو INCEST TABOO کہتے ہیں۔

خاص اس وقت جب میں کارلٹن کالج پہنچا کمبوڈیا میں امریکن فوجوں کی پیش قدمی کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے سٹوڈنٹس یونین کی عمارت نشر و اشاعت کا مرکز بن گئی تھی، تعلیم کا کام بند تھا، اور تقریروں کا سلسلہ جاری۔ کوئی دس گیارہ لڑکوں لڑکیوں نے احتجاج کے طور پر چار دن کا برت رکھنے کا عہد کیا تھا۔ ان میں سے اکثر اپنی تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان آنے والے تھے اور شاید برت رکھنے کا خیال بھی اسی وجہ سے آیا۔ ۷ مئی کی شام کو میرا غالب پر لکچر رکھا گیا تھا، جب پروفیسر ہیتھ کوکس مجھے لیکر وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ سٹرائک کرنے والے طالب علموں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر وہاں کمبوڈیا پر تقریر کرنے کے لئے کسی اور کو بلایا ہے۔ میں نے کہا کچھ حرج نہیں، میرا لکچر کسی اور وقت کرا دیجئے گا، لیکن انھوں نے طے کیا کہ میرا لکچر ایک اور ہال میں ہوگا جو خالی تھا، اور پھر اعلان کرایا کہ جو طالب علم غالب پر لکچر سننا چاہیں وہ وہاں چلے چلیں۔ اس پر طالب علموں کی خاصی تعداد ساتھ چلی، اور جہاں تک میں اندازہ کر سکا، لکچر شوق سے سنا۔ دوسرے دن صبح ۱۰ بجے سے ۱۲ بجے تک دو گھنٹے اس لئے رکھے گئے تھے کہ اگر کوئی طالب علم مجھ سے ملنا چاہے تو مل سکے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ایک لڑکی جو ہندوستان آنے والی ہے اور برت رکھنے میں شریک تھی ملنے آئی، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرکے اس نے غالب کے ترجمے سننے کی خواہش ظاہر کی، جو کچھ میں نے سنایا

سنتی رہی اور آخر میں خود مجھے کہنا پڑا کہ ترجموں کا خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ سہ پہر کو تین بجے غالب خوانی کی محفل ہوئی۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے اپنے کام کے بارے میں مشورہ چاہا، اور باتیں کرتے کرتے مجھے اپنے ہوسٹل میں، جو مخلوط ہوسٹلوں میں سے تھا لے گیا اور دیر تک دینی اور اخلاقی مسائل کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔

یہ امریکی نوجوانوں کے مزاج کا دوسرا رخ ہے۔ مگر میں نے جو مثالیں دی ہیں ان سے کہیں زیادہ اہم کارلٹن کالج کے طالب علموں کا یہ مطالبہ ہے کہ ان کے کالج میں نیگرو لڑکوں لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ کالج نے ان کا یہ مطالبہ منظور کرلیا ہے اور ایک نیگرو پروفیسر کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ملک کا دورہ کریں اور کالج کے لئے نیگرو طالب علموں کا انتخاب کریں۔ دولت مند طالب علموں میں کچھ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ انھیں ان کے حق سے زیادہ مل رہا ہے اور زندگی کی نعمتیں انصاف کے مطابق تقسیم ہونی چاہئیں، مگر یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس جذبہ میں کتنی گہرائی ہے اور اس کا ثبات کتنا ہوگا۔

طالب علموں میں بے چینی مسوری یونیورسٹی میں بھی تھی، دوسری یونیورسٹیوں کی طرح یہاں بھی استادوں اور طالب علموں میں کوئی اختلاف نہ تھا، اگرچہ استادوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ طالب علموں کی رہنمائی کیسے کریں۔ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ سے سب ناخوش تھے، اس لئے کہ ان کا برتاؤ اچھا نہیں تھا۔ میرے پہنچنے کے دوسرے دن طالب علموں نے طے کیا کہ یونیورسٹی کے دفتروں کی عمارت کے سامنے مظاہرہ کریں گے اور کسی کو اندر نہ جانے دیں گے۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب جب پریزیڈنٹ کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو انھوں نے مجمع کو ہٹانے کے لئے یونیورسٹی کی پولیس کو بلا لیا اور پولیس نے تیس پینتیس طالب علموں کو گرفتار کرلیا۔ لیکن جلد ہی طالب علموں کی کیفیت دیکھ کر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، اور وہ طالب جنھیں پولیس نے گرفتار کیا تھا چھوڑ دئے گئے۔ اب طالب علموں کی طرف سے جو مطالبے کئے گئے ان کا امریکہ کی سیاست اور کیمبوڈیا سے کوئی تعلق نہ تھا، انھوں نے کہا کہ فلاں امتحان ملتوی کر دیا جائے، جو طالب علم سیاسی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ

سے اپنا کام پورا نہیں کرسکتے تھے ان کے ساتھ رعایتیں کی جائیں، وغیرہ وغیرہ۔

امریکہ کی ہر یونیورسٹی میں جہاں جنوبی ایشیا سے متعلق علوم کا شعبہ ہے بیشتر ایسے لوگ درس دیتے ہیں جو ہندوستان ہو آئے ہیں۔ مسوری یونیورسٹی میں امتیاز احمد صاحب نے، جو میرے اور میرے پروگرام کے ذمہ دار تھے، پروفیسر بیریر سے ملایا، جو پنجاب کی تاریخ کے ماہر ہیں اور صورت اور انداز سے سکھ معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ سکھ ہندو نہیں ہیں، اور تاریخی مواد جمع کرنے کے سلسلے میں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پندرہ سو روپے میں امرت سر کی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے اس کے قیام سے اس وقت تک کے تمام جلسوں کی روداووں کی نقل حاصل کر لی ہے۔

مسوری یونیورسٹی آخری جگہ تھی جہاں کچھ اطمینان سے رہنے کا موقع ملا۔ لوس اینجلیز میں زین العابدین رفاعی صاحب نے اپنے یہاں مہمان رکھا اور برابر ساتھ رہے، باقی اساتذہ، جیسے کہ پروفیسر فون گرون باؤم، یونیورسٹی کے انتظامی اور سیاسی معاملات میں ایسے مصروف تھے کہ ان سے بس رسمی دعوتوں میں سرسری ملاقات ہو سکی۔ سین فرینسسکو میں وحشت زدگی کا وہی عالم تھا جو کہ ہارورڈ میں، اور اب یاد کر کے تعجب ہوتا ہے کہ وہاں ہندوستانی مسلمانوں پر میری ایک تقریر بھی ہو گئی۔

امریکہ میں بہت ہی مختصر ملاقات سے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ کم از کم لوگ کہتے یہی ہیں۔ ان کے نظام حیات میں یہ ممکن ہی نہیں معلوم ہوتا کہ ایک انسان دوسرے سے رفتہ رفتہ اثر لے، سوائے اس کے کہ کوئی مستقل باضابطہ رشتہ قائم کیا جائے۔ سفر کے دوران ایک جگہ کی زندگی کا جو دھندلا سا نقشہ ذہن میں قائم ہوا اسے حرکت کی برکت نے بہت جلد مٹا دیا، دنیا ایک سڑک بن گئی جس پر جہاں تک نظر جاتی سرپٹ بھاگتے ہوئے موٹر دکھائی دیتے، اور آسمان وہ خلا جس کی وسعتوں کو پُر کرنے کے لئے سینکڑوں ہوائی اڈوں سے سینکڑوں ہوائی جہاز اڑائے جاتے ہیں۔

روشؔ صدیقی

غزل

کون کہتا مجھے شائستۂ تہذیبِ جنوں
میں تری زلفِ پریشاں کو اگر چھیڑ نہ دوں

کون حسرت زدۂ شوقِ تکلّم ہے یہاں
لڑکھڑاتا ہے تری چشمِ سخن گو کا فسوں

یہ ہجومِ غمِ دوراں میں کہاں یاد رہا
داستانِ غمِ دل تیرے تغافل سے کہوں

کیا خبر، خیمۂ لیلیٰ کے نگہبانوں کو
کہ حریمِ دلِ لیلیٰ میں ہے مہماں مجنوں

رنگ رہ رہ کے ترے رُخ کا اُڑا جاتا ہے
ورنہ میں اور تری محفلِ تمکیں سے اُٹھوں

قیدِ ہستی میں یہ اک گوشۂ دامانِ خیال
پھر غنیمت ہے کہ زنداں میں بھی آزاد تو ہوں

ہو سلیقے سے بہکنا تو مزا دیتا ہے
میرے ساقی کو گماں ہے کہ بہت ہوش میں ہوں

جستجو کی کوئی منزل جو نہیں ہے تو نہ ہو
ہمتِ عشق یہ کہتی ہے کہ بڑھتا ہی رہوں

اب ترے حال پہ تجھ کو دلِ ناداں چھوڑا
سوچنا بھی تو قیامت ہے کہاں تک سوچوں

میں نے پہچان لیا اُس کو سرِ بزم روشؔ
اس کی آنکھوں کو ہے اصرار کہ خاموش رہوں

سید جمال الدین

لیوپولڈ رانکے

۱۷۹۵ــــــ۱۸۸۵

۱۸۲۵ء میں لیوپولڈ رانکے برلن میں تاریخ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے اپنی آمد سے فن تاریخ نگاری (Historiography) میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ رانکے نے فن تاریخ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اسی لئے اُسے جدید فن تاریخ نگاری کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

وہ ایک متوسط گھرانہ کا فرد تھا۔ ۱۸۱۴ء میں وہ لیپزگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ فلسفہ اور دینیات اس کے خاص مضامین تھے۔ وہ علم اللسان اور فلسفہ کے لکچر غور سے سنتا۔ کانٹ کی کتاب 'تنقید عقل محض' (Critique of Pure Reason) نے رانکے کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن اس پر سب سے زیادہ اثر فشتے کا ہوا۔ وہ گوئٹے کا قدردان تھا لیکن طرز فکر اور انداز بیان میں اس کی نقل نہیں کرتا تھا۔ رانکے نے لوتھر کا مطالعہ بھی کیا تاکہ جرمن زبان کی مشق بہم پہنچا سکے۔ ابھی تک اس نے تاریخ کو بالکل نظرانداز کیا۔ نیبہر واحد مورخ تھا جس نے اسے اُس وقت تک متاثر کیا۔

ذہنی تجسس اور معلومات حاصل کرنے کی خواہش نے رانکے کو تاریخ کے مطالعہ کے لئے آمادہ کیا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور فرینکفورٹ میں لاطینی اور یونانی کلاسک کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے ہومر، ہوریس اور ورجل کے افکار اور کلاسیکی ادب کی تاریخ پڑھائی۔ بہت جلد اس نے محسوس کیا کہ اسے ماضی کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور صرف ادیبوں پر اکتفا کرنا کافی نہ ہوگا۔ اس طرح اس نے باقاعدہ کلاسیکی مورخین کا مطالعہ شروع کیا۔ تھیوسیڈڈیز سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اب اس نے دوسرے مورخین کا انہی کی زبانوں میں مطالعہ کیا۔ جن میں

ہیروڈوٹس، اکیسی نوفن، لیوی اور ٹیسی ٹس قابل ذکر ہیں ۔ وہ مطالعہ کے ساتھ ان پر نوٹس بھی لکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنی معلومات کا دوسروں کی معلومات سے موازنہ کیا۔ اولذکر ادیب اور لیوی میں اس نے صنمیات کے عناصر زیادہ پائے۔ صرف تھیوسی ڈائڈیز اطمینان بخش تھا، حالانکہ رانکے کے تنقیدی ذہن نے اس کے تمام نتائج کو تسلیم نہیں کیا۔ آزادی فکر ہی دراصل اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

رفتہ رفتہ اصلی تاریخی تحقیقات کی فریفتگی نے رانکے کے ذہن کو تاریخ کی بے پناہ وسعتوں کی طرف متوجہ کیا۔ قدیم روم کے تحقیقاتی مطالعہ کے بعد وہ دور وسطیٰ کے جرمنی کی طرف رجوع ہوا۔ اب رانکے نے ان تبدیلیوں کا سراغ لگانا شروع کیا جو قدیم روم سے دور وسطیٰ کے جرمنی کی تاریخ میں ہوئی تھیں۔ آخری عہد وسطیٰ کے مطالعہ کے دوران اس نے محض تفریح کی خاطر سر ولیم اسکاٹ کے افسانوں کو دلچسپی سے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن رانکے نے ناولوں میں بھی حقیقت سے مبرّا باتوں کو ناپسند کیا۔ اسکاٹ کی روشن اور تابدار تصویر کشی اس کے لئے فرحت بخش تھی لیکن اس کی تاریخی غلطیوں سے وہ چراغ پا ہوجاتا تھا۔ رانکے اسکاٹ کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ وہ تاریخ کی عدالت میں ایک مجرم تھا اس لئے کہ اس نے تاریخ میں ایسے خاکے کھینچے جو قطعی غیر تاریخی تھے، لیکن اس کے پیش کرنے کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُن پر یقین رکھتا تھا۔ تاریخ اور افسانہ کا موازنہ کرنے سے اسے معلوم ہوا کہ خیالی فسانہ کے مقابلہ میں تاریخی ذرائع زیادہ دلکش اور لازمی طور پر دلچسپ ہوتے ہیں۔ اسی لئے رانکے نے فسانہ سے بالکل منہ موڑ لیا اور یہ طے کیا کہ اپنی تحریروں میں وہ فسانہ سازی اور دروغ گوئی سے گریز کرے گا اور سختی سے حقائق کا پابند رہے گا۔

مندرجہ بالا پس منظر میں رانکے کا ذہن اور طریقۂ فکر اپنی جھلکیاں دکھا رہا ہے۔ اس کے ذہن کی ہر جھلک ظاہر کرتی ہے کہ وہ حقائق کا کتنا احترام کرتا تھا اور صحت کا کتنا خواہشمند تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہ نسبت فسانہ کے حقیقی تاریخ زیادہ دلکش اور دلچسپ ہے۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ رانکے نے تاریخ کے مطالعہ اور تحریر میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لی اور کس طرح اس کے نوک قلم

ے تاریخی حقائق اکیانوے سال کی عمر تک افشا ہوتے رہے۔

جب وہ فرینکفورٹ میں تھا تو رومانی تحریک اپنے عروج پر تھی اور اسی طرح میٹرنیک کا ردِ عمل بھی۔ لیکن رانکے ان تحریکوں سے الگ تھلگ رہا۔ وقت و زمانہ کے خلاف اس کا ردِ عمل بھی انوکھا تھا۔ وہ قدامت پسند لیکن فطرتاً معتدل تھا۔ اس نے ہمعصر حکومتوں کی لبرل تحریکوں اور اشخاص کے خلاف سخت اقدام کو ناپسند کیا۔ وہ بخوبی واقف تھا کہ ماحول ہی خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے باوجود رانکے سیاسی طور پر حساس نہ تھا۔

لیکن رانکے رومانٹک تھا اور حقیقتاً مذہب کا پیرو بھی۔ اس کے دل میں مذہب کی دہشت اس اندر بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ مذہب سے مرعوب ہو کر تاریخی عمل کے بارے میں سوچتا۔ اس کے خیال میں وہ لوگ جو زمانہ سلف کے بارے میں سطحی باتیں کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب گناہگار تھے وہ قابل الزام ہیں، جو تاریخ کے ساتھ بھلا سلوک کرتے ہیں وہ غیبی سزا کے مستحق ہیں، کیونکہ تاریخ وجود الہٰی کا ثبوت ہے۔ تمام تاریخ میں خدا کا وجود اور اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہر فعل اس کی موجودگی کی تصریح کرتا ہے، ہر لمحہ اس کے نام کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن رانکے کو یہ سب زیادہ تر تاریخ کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔ ان مذہبی خیالات نے اس کے طرز زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

انہی دنوں رانکے اپنی پہلی کتاب لکھ رہا تھا۔ جس نے اسے قومی شہرت دی اور جس کے باعث اسے برلن یونیورسٹی میں جگہ دیدی گئی۔ یہ کتاب تھی 'لاطینی اور ٹیوٹونک قوموں کی تاریخ' جو ۱۸۲۴ء میں منظر عام پر آئی۔ رانکے کی کتاب میں وہ تازگی اور نیا پن تھا کہ دنیا نے اسے ایک ابھرتا ہوا آدمی کہہ کر پکارا اور مرحبا کہا۔ کتاب کی خوبی تین باتوں میں پنہاں ہے۔ رومن جرمن دنیا کی وحدت کا خیال، تاریخی ذرائع کی زیرک تنقید اور کتاب کی تمہید میں یہ اعلان کہ تاریخ لکھنے میں اس کی منشا وہ تاریخ دکھانا ہے جو واقعی تھی۔

رانکے نے ان تسلیم شدہ وحدتوں کو ماننے سے انکار کر دیا جو اس وقت روایتی طور پر مسلمہ سمجھی جاتی تھیں۔ اُس کے خیال میں آفاقی عیسائیت کی وحدت ایسی چیز نہیں تھی، جس کو ماننا

جائے کیونکہ اُس تصور کے مطابق تو دراصل آرمینیا کے باشندوں کو بھی شامل کرنا پڑے گا جو یوروپین نہیں ہیں اس طرح اُس نے یوروپی وحدت کے خیال کو بھی رد کر دیا کیونکہ اس کا مطلب ترکوں اور روسیوں کو بھی شامل کرنا ہوگا۔ اب باقی کیا رہتا ہے جس کے لئے یوروپین وحدت کا دعویٰ کیا جائے۔ رانکے کا جواب تھا کہ یوروپی تہذیب رومن اور جرمن عناصر کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اس کے خیال میں وحشی اور ناشائستہ بربری اقوام نے تنزل کی طرف جاتی ہوئی سلطنت کے تہذیبی عناصر کو اپنی تہذیب میں سمو لیا۔ اس طرح سرزمین یورپ پر کچھ خاص ادارے قائم ہوئے، جیسے ریاست اور کلیسا، سلطنت اور پاپائیت۔ رانکے نے ان اداروں کے عروج پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ نقاد رانکے کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ یوروپی تاریخ کی ابتدا رومن جرمن اقوام کی ترقی کے ساتھ ہوئی۔

تاریخی ذرائع کی تنقید کے مسئلہ پر رانکے نے ایک الگ ضمیمہ مرتب کیا جس نے جدید تنقیدی تاریخ نگاری کا آغاز کیا۔ رانکے نے بحث کا آغاز اس سوال سے شروع کیا کہ کون سے طبع شدہ ذرائع تازہ اطلاعات کے حامل ہیں۔ اس کے بعد اس نے چند معروف مورخین کا انتخاب کیا اور ایک ممتحن کی طرح ان کی تصانیف کی سختی سے جانچ کی۔

'کیا کرنا باقی ہے' عنوان کے تحت رانکے نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہم پہلے وہ دہراتے ہیں جو اس زمانہ کے عام مورخین کے بارے میں کہا گیا یعنی یہ کہ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ان کی اطلاعات نہ کافی تھیں اور نہ معتبر، اور یہ کہ جب تک ہم ان کی تقلید کریں گے اپنے کو اندھیرے میں محسوس کرتے رہیں گے۔ یوں رانکے نے ثابت کیا کہ حقیقتاً عام تاریخ کو ذرائع تسلیم کرنا لاحاصل ہے۔ مزید یہ کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ معلومات سے بچنے کے لئے ایک مورخ کو لازمی طور پر آرکائیوز اور دستاویزات سے استفادہ کرنا چاہئے۔ رانکے کی مقبولیت اس لئے بھی ہے کہ اس نے مورخین کو اندھیرے سے نکال کر ایک نئے راستے کی روشنیوں کو سمیٹنے کی دعوت دی۔

مئی ۱۸۲۵ء میں رانکے برلن یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک خاص پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ وہاں پہلے مغربی یورپ کی تاریخ اس کے سپرد کی گئی۔ وہ ایک کمزور اور منحنی سی شخصیت کا مالک تھا۔ اس میں ایک ہر دلعزیز استاد کی سی کوئی وضع نہ تھی۔ اس کی کامیابی اور شہرت کا راز اس کی معلمی میں نہیں بلکہ اس ذہانت میں ہے جو اس نے ایک استاد کی حیثیت سے تاریخ کے سیمینار میں دکھائی۔ اس سیمینار کا سنگ بنیاد بھی اسی نے رکھا تھا۔ رانکے کے اس سیمینار سے ایسے عالم نکلے جن میں سے سو سے زیادہ تو خود جرمنی کی دوسری یونیورسٹیوں میں معلم بن گئے۔ اور انھوں نے رانکے کی روایات پر مزید طلبار کی تربیت کی۔ رانکے کی روایات پر تربیت شدہ طلبار جرمنی میں ہی نہیں امریکہ میں بھی مورخ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

رانکے کے لئے سیمینار اپنی اختراع نہیں تھی۔ برلن میں اپنے پہلے سیمسٹر میں اس نے تاریخ کی تعلیم دینے کے لئے ایک نیا نصاب پیش کیا۔ نصاب کا ایک مقصد طالب علم کو استاد کے قریب لانا تھا اور دوسرا مقصد تاریخ کے لئے معلم کی تربیت دینا تھا۔ رانکے کا سیمینار بعد کے تمام سیمیناروں کے لئے ایک مثال بن گیا۔

استاد نے شاگردوں کے دل میں جو اصول دل نشین کئے وہ مختصراً یہ تھے، معاملہ کی سچائی اور ذرائع کی تہہ تک پہنچو، ہر دستاویز میں تھوڑے بہت داخلی عناصر ہوتے ہیں، ایک مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ خارجی عناصر کو داخلی عناصر سے جدا کرے، بہ الفاظ دیگر جزوِ اصلی تک پہنچے۔ طالب علموں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تین اصول ذہن نشین کرلیں، تنقید، باریک بینی اور تہہ تک پہنچنا۔

۱۸۲۷ء میں رانکے نے اپنی دوسری کتاب بہ عنوان 'سولھویں اور سترھویں صدی میں جنوبی یورپ کے شہزادگان اور عوام' چھپوائی۔ یہ کتاب جیسا کہ اس نے بعد میں تسلیم کیا، یونانیوں اور ترکوں کے خلاف بغاوتوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب اس کی پہلی کتاب سے سبقت لے گئی، خاص کر اس لئے کیونکہ اس میں پہلی مرتبہ کافی جگہ غیر سیاسی امور پر بحث کی گئی ہے (مثلاً مالیات اور معاشیات وغیرہ)

اس کتاب کی تکمیل کے بعد پرشیا (Prussia) کی حکومت نے اس کو مزید علمی تحقیق کے لئے دور دراز مقامات پر بھیجا۔ اس کے بعد رانکے نے نادر تخلیقات پیش کیں۔ اس نے کئی تاریخیں لکھیں مثلاً جرمنی، انگلینڈ، پرشیا، فرانس کی تاریخیں، جنگوں کی تاریخیں اور سیاستدانوں کی سوانح حیات۔ تاریخ عالم کے علاوہ اس کی تمام تصنیفات چوّن جلدوں پر مشتمل ہیں۔ 'پوپس' اس کی سب سے معروف کتاب ہے اور شاید اس کی بہترین کتاب بھی۔ اس کتاب کی ترتیب کے لئے اس نے اٹلی کے آرکائیوز کو چھان مارا۔ سوانح حیات اور ادبی تصویرکشی نشاط ثانیہ کی تاریخ نگاری کا خاصہ تھیں اور رانکے ان تاریخی ذرائع سے جن کا اس نے مطالعہ کیا تھا اتنا متاثر تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ماضی میں کھوئے ہوئے فن کا بغیر کسی جانی بوجھی کوشش کے احیا کر رہا ہو۔ اس کی تحریروں میں کردار نگاری کی افراط ہے۔ رانکے کی ناقدانہ باریک بینی نے اسے ان کوتاہیوں سے محفوظ رکھا جو عام طور سے سوانحی تاریخ میں داخل ہو جاتی ہیں۔

سولھویں، سترھویں اور اٹھارہویں صدیاں رانکے کا موضوع تھیں۔ 'پوپس' کے علاوہ اس نے 'ایک تاریخ فرانس خاص کر سولھویں اور سترھویں صدی میں' تصنیف کی جو پڑھنے والے کو ایک عالیشان عمارت کا تاثر دیتی ہے۔ 'انگلینڈ کی تاریخ خاص کر سترھویں صدی میں'، جو برطانیہ کے مورخین کے خیال میں ایک الہام سادی تھی، تاریخ کے بجائے اس عہد کی تاریخ کی تفسیر زیادہ ہے۔

۱۸۷۱ء میں رانکے معلمی سے سبکدوش ہو گیا اور بقیہ زندگی تاریخ کی تصنیف کے لئے وقف کر دی۔ اس نے اکیانوے سال کی عمر پائی اور اس پر کبھی تھکن کے آثار نہیں پائے گئے۔ وہ ہمیشہ اپنے کام میں مشغول رہا۔ سن رسیدہ رانکے میں غیر معمولی قوت تھی۔ اُس کے دو مددگار تھے جن کو وہ تھکا دیتا تھا لیکن خود کبھی وہ تھکا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ صبح نو بجے اٹھتا اور ایک مددگار کے ساتھ روز ساڑھے نو بجے صبح سے دو بجے بعد دوپہر تک کام کرتا رہتا اور پھر دوسرے مددگار کے ساتھ شام کے سات بجے سے شب کے بارہ بجے تک کام کرتا رہتا۔ کرسمس کے علاوہ نہ تفریح کے لئے کوئی وقت تھا اور نہ کوئی دوسری تعطیلات۔ اپنے مددگاروں کے ساتھ اس کا طریقۂ کار

بہت دلچسپ تھا۔ وہ آرکائوز سے دستاویزات لاتے اور اس کے سامنے پڑھتے۔ رانکے خاموشی سے سنتا اور ایک دم چونک کر کہتا "اسے چھوڑو، یہ غیر ضروری ہے" یا کہتا "ٹھہرو، یہ بہت اہم ہے، ہم کو جوں کا توں نقل کر لینا چاہئے۔" ایسے ہی انتخابات سے اس نے مختلف تاریخیں لکھیں۔ رانکے کتاب لکھنے کے لئے منظم ترتیب کا قائل نہ تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس طرح وہ اپنی خواہش کی تکمیل ہی نہیں کر سکتا تھا۔

تیراسی سال کی عمر میں رانکے کو خیال آیا کہ وہ انسانیت کے بارے میں اپنے علم سے استفادہ کر کے اس کا لب لباب ایک کتاب میں پیش کرے جس کا عنوان ہو "تاریخ عالم"۔ پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی، اور اس کے بعد ہر سال ایک جلد منظر عام پر آنے لگی۔ اس طرح اس کے سال وفات تک (۱۸۸۶ء) میں چھ جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور ساتویں جلد پریس میں جانے کے لئے تیار تھی۔ اکیانوے سال کی عمر میں اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ فلسفۂ تاریخ لکھا جائے، افسوس اسے وہ عملی جامہ نہ پہنا سکا اور اس دنیا سے رخصت ہوا۔

رانکے کی "تاریخ عالم" اس کے فلسفہ اور طریقہ کے بارے میں اتنا ہی عمدہ پیش لفظ ہے جتنا کہ اس کی دوسری تصنیفات۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ رانکے نے اپنی آخری تخلیق میں ان خیالات کا انکشاف کیا ہے جو اس نے فرنیکفورٹ میں رہکر (جب وہ نوجوان ہی تھا) اپنے خطوط میں قلمبند کئے۔ رانکے کا خیال تھا کہ عالمی تاریخ کے کرداروں کا مطالعہ اس طرح ہو کہ یہ تلاش کیا جا سکے کہ کس حد تک ان کرداروں سے غیبی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ فرد اور قوم دنیا کی تحریک اور اس کی حرکت میں ذریعہ کی طرح ہیں۔ ان ذرائع کو خدا سے منسلک کرنے والا وسیلہ "افکار" ہیں۔ کروچے نے رانکے کے اس طرح کے عام تصورات پر تنقید کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رانکے کو زوردار الفاظ سے، بے معنی اصطلاحات اور محاوروں سے کھیلنے کی عادت تھی۔ مثال کے طور پر رانکے ایک جگہ لکھتا ہے، افکار "دنیا میں خدا کے خیالات ہیں"، "وہ زندگی بخشتے ہیں، وہ بذات خود زندگی ہیں، اخلاقی قوت ہیں"۔ انہی خیالات کے بننے اور بگڑنے، ان کے پیدا ہونے اور ختم

ہوجانے میں ہی تاریخ کا بڑا راز پوشیدہ ہے۔"

نیم صوفیانہ روش کے باوجود رانکے بنیادی طور پر تجرباتی مزاج کا آدمی تھا۔ عام طور پر رانکے میں ایسا رویہ پایا جاتا ہے جو تجربی طریقہ سے مل جاتا ہے۔ رانکے کا تجربی طریقہ ہی اس کی شہرت کا باعث بنا۔ اسے روایت، سنی سنائی بات، گپ اور مختصراً ہر وہ چیز جس کی اصلیت نہ ہو اس پر ذرہ برابر اعتبار نہیں کیا۔

نوّے سال کی عمر میں رانکے اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ میں ہر اُس چیز سے گریز کرنا چاہیے جو بنیادی طور پر معتبر حقائق سے دور ہو۔ تحریر شدہ حقائق سے وابستہ رہنا رانکے کا بنیادی اصول تھا۔ رانکے کی ہر اس چیز پر بے اعتباری جسے وہ کاغذ پر نہ دیکھ سکے اور جس کی جانچ پڑتال نہ کر سکے اتنی زیادہ تھی کہ اس نے تاریخ کے اہم ابواب اور ادوار کو صرف اس لئے نظرانداز کر دیا کہ ان کے لئے دستاویزات میسر نہ تھیں۔ اس لئے اس نے زمانہ سلف یا معاشی تاریخ پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس کو اَسرار سے نفرت تھی۔ رانکے کا اصول تھا کہ تاریخ صرف اس مواد کی بنیاد پر لکھی جائے جو تحریریں محفوظ ہو۔ اس سلسلہ میں اس کا کہنا تھا کہ وہ بات جو زبانی طور پر ہم تک پہنچی ہے اسی وقت قابل قبول ہے جبکہ ہم اس کی بنیاد پر کسی بات کا یقینی طور سے حکم لگا سکتے ہیں۔ اپنی پہلی تصنیف ہی میں رانکے نے اپنے طرز کو اس طرح واضح کیا: "تاریخ کو یہ منصب سونپا گیا ہے کہ وہ ماضی کی تحقیق کرے اور ہمارے مستقبل کے بھلے کے لئے ہمیں ہدایت دے۔ یہ موجودہ تصنیف اتنے بلند کام کا قصد نہیں کر رہی ہے۔ اس کا مقصد محض یہ دکھلانا ہے کہ حقیقتاً ماضی میں کیا اور کس طرح ہوا۔" اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کا سب سے بڑا اصول یہ رہا کہ حقائق کو سختی سے پیش کیا جائے چاہے وہ کتنے ہی غیر مشروط اور بدشکل کیوں نہ ہوں۔

تاریخ میں صداقت دریافت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تاریخی ذرائع سے استفادہ کیا جائے اور خاص طور پر آرکائوز سے مدد لی جائے۔ لہٰذا رانکے نے مختلف آرکائوز میں تحقیق کا کام کیا۔ مواد جمع کرنے کے بعد رانکے نے ان کی نسبتی قدر و قیمت دریافت کی اور

پھر تصنیف شروع کردی۔ اس کا کہنا تھا کہ تاریخ ایک ہی وقت میں فن بھی ہے اور علم بھی، اُسے تنقید اور علمیت کے تمام مطالبوں کو پورا کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو ان تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی خوش کرنا ہے جیسے دوسری کامیاب ادبی تخلیقات کرتی ہیں۔ رانکے بے شبہ ایک فنکار تھا۔ وہ ایک زیرک ماہر نفسیات نہیں، لیکن مردم شناس تھا۔ مزید یہ کہ افراد کو ان کے تاریخی پس منظر میں رکھنے میں ماہر تھا۔ اس فن میں شاید وہ نشاۃ ثانیہ سے متاثر تھا، بالخصوص تصویر کشی سے۔ رانکے ایک بہترین مصور تھا اور وہ خوبصورت اور موزوں الفاظ سے تصویریں بناتا تھا۔ رانکے نے اپنی عبارت پر ادنیٰ، بے معنی، عام اور مکرر تفصیلات کا بارگراں نہیں ڈالا، لیکن اس کے ہاں وضاحت اور تفصیل ہے، ترتیب وار بیان کا سلیقہ ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

رانکے ایک بڑا عالم اور ایک ذہین مصنف تھا۔ اس نے خارجی اور بے لاگ صداقت کا دعویٰ کیا ہے اس لئے یہ سوال کرنا بجا ہوگا کہ کیا وہ ثابت قدم تھا؟ اور کیا یہ ممکن بھی ہے؟ سب سے پہلے اس بات پر زور دینا چاہئے کہ رانکے نے دستاویزی ذرائع کے خبط کی وجہ سے کئی اہم باتوں سے غفلت برتی جیسے سوانح نگاری۔ اس غفلت نے اس کے طریقہ کو کسی حد تک محدود کر دیا۔ رانکے کی دستاویزات نے اسے ایک قسم کی تاریخ دی، لیکن وہ مشکل سے ہی ایک عالمی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ اسے ریاستوں، قوموں، مذاہب اور تہذیب وغیرہ یا کسی اور چیز کے بارے میں زیادہ عام معلومات نہ مل سکیں۔

لیکن رانکے اور رانکے مکتب کی غیر باطنی اور حقیقی تاریخ کے خلاف تنقید کا باعث سب سے زیادہ اس کا مجموعی طور پر غیر فلسفیانہ انداز ہے۔ سائنٹیفک ہونا تو درکنار رانکے بڑی حد تک جانب دار تھا۔ اس نے تمام تاریخ میں خدا کی کاریگری دیکھی۔ اس نے خالص فلسفہ یا نفسیات کو شکل دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ دراصل رانکے خود اپنے زمانہ ہی کی ایک پیداوار تھا۔ وہ پرشین بادشاہت کا ایک وفادار ملازم اور کلیسا اور ریاست کا حامی تھا۔ جو کچھ اس نے تصنیف کیا اس کے خیالات، میلان اور مفاد کا مکمل عکس تھا۔ رانکے نے تاریخ میں معاشرتی اور اقتصادی مفاد کو نظر انداز کیا۔

اس نے ہر اس تاریخی تصنیف سے گریز کیا جس میں ہمعصر یورپ کے دقیانوسی خیالات سے اختلاف کیا گیا تھا۔ ان دلائل کی بنیاد پر رانکے کا نام انیسویں صدی کے جانب دار مورخین کی فہرست میں درج کیا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ رانکے کا فن تاریخ نگاری کے لئے سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو علم (Science) کی حیثیت سے مانا۔ اس نے تاریخ کو کسی اور چیز کی کنیز نہیں سمجھا اسی لئے وہ ایسے طریقے کے لئے کوشاں رہا جو تاریخ میں خارجی صداقت کی طرف رہنمائی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر اس چیز کو رد کیا جو ثابت نہیں تھی یا جس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ اسی لئے اس نے مخفی یا خیالی میدانوں میں داخل ہونے سے انکار کیا۔ رانکے نے ماضی کے مقابلہ میں بے لاگ انداز نظر، توازن اور زیادہ دور اندیشی کی طرف رہنمائی کی۔ یہی اس کی عظمت ہے، یہی اس کی شان ہے۔ بنیادی طور پر رانکے کا خاص اثر سیاسی تاریخ نگاری پر تھا۔ وہ بذات خود ایک سیاسی مورخ تھا اور اس کے شاگردوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

پن چکی

باباشاہ مسافرؒ بخارا سے تن تنہا نکل کر اورنگ آباد پہنچے، جسے دکن کا کشمیر کہا جاتا تھا۔ کتنی اولوالعزم اور برگزیدہ ہستی تھی۔ جب باباشاہ مسافر نے ہمیشہ کے لئے اورنگ آباد میں رہنا پسند کیا تو پن چکی کی جگہ اپنے لئے تجویز کی۔ اس وقت برگد تلے بسم اللہ شاہ بخاری خلقت کے ہجوم میں گھرے ہوئے تشریف فرما تھے، جوں ہی آپ آئے بسم اللہ شاہ بخاری اٹھ کھڑے ہوئے اور بے ساختہ کہہ اٹھے۔ "آب آمد تیمم برخاست۔" اسی وقت سلطان گنج چلے گئے۔

پن چکی میں برگد آج بھی کھڑا ہے۔ یہ برگد سب سے بلند، گھنا اور سایہ دار ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی عمر ہزار سال ہے۔ اس برگد تلے بسم اللہ شاہ بخاری کی نشست تھی۔ جہاں زیادہ تر سادھوؤں، سنیاسیوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اسی برگد کے پیڑ سے ذرا فاصلے پر چوکور کنواں تھا جو اب بڑے حوض کے اندر ہے۔ یہیں غالباً تکیہ بھی تھا جو شاہ عنایت کا تکیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا عجیب وغریب کنواں ہے۔ پانی جھرنوں کی طرح ابلتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا پانی جاری ہے جس کو زندہ پانی کہتے ہیں۔ لیکن یہ پانی لوگوں کی ضرورتوں کے لئے ناکافی تھا، باباشاہ مسافرؒ نے اس کنویں کو، جس کی گہرائی اسی فٹ ہے، اسی طرح رہنے دیا۔ عام قیاس یہ ہے کہ اس پر جو نہر بنائی گئی ہے اسے ملک عنبر[1] نے بنایا ہے، یہ وہی ملک عنبر ہے جو جنوبی ہند

---

[1] ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۷۵ھ میں پیدا ہوا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا زبردست سپہ سالار، فرمانروا، جید عالم، ماہر علم نجوم اور انجینیر تھا اور جس کا آج تک ثانی پیدا نہیں ہوا۔ اس مہارت کا ثبوت یہ نہریں ہیں، جو ثواب جاریہ کی شکل میں جاری ہیں۔ اگر انسان کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اورنگ آباد کو نہروں کا شہر کہیں تو بیجا نہیں ہے۔ یہاں سے سولہ میل دور دولت آباد میں تغلق نے ہندوستان کا تخت وتاج دہلی سے منتقل کیا۔ اورنگ زیبؒ نے جو شہنشاہ ہند تھا، مرکر بھی یہیں دفن ہونا پسند کیا۔ اگر ملک عنبر نے بھی دکن کے کشمیر کو منتخب کیا تو حیرت کی بات نہیں ہے، اس نے کل باون نہریں بنوائیں جو اس تاریخی شہر میں چاروں طرف جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، لیکن انگریزوں نے نہروں کے زیرزمین فلٹر سسٹم کی ٹکنک کا پتہ چلانے کے لئے نہروں اور دیوہیکل پانی کی لاٹوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ تمام نہریں سوکھ گئیں، زمین کھدوا کر تقطیری اصول دیکھنا چاہا لیکن پانی یک لخت غائب ہوگیا۔ ایک بوڑھے مزدور نے وہاں ریت پر تپلی چھڑی برمے کی طرح چلائی تو پانی سوتوں سے ابلنے لگا۔ انگریزوں نے اس بوڑھے پر جبر وتشدد کر کے نہروں کا سسٹم دریافت کرنا چاہا، مگر اس نے تبلانے سے انکار کر دیا جس کی پاداش میں انگریز انجینئر نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بہرحال انگریزوں کو پتہ نہ چلا کہ کیا سسٹم تھا اور پانی کہاں سے لایا جاتا تھا۔ ایک دن ملک عنبر نے اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر خدا سے دعا مانگی :

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مکہ میں ابتدائی تعلیم وتربیت پائی اور دکن کے بازار میں آکر فروخت ہوگیا۔ احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا۔ آقا کی وفات کے بعد ۹۸۲ھ میں ملک عنبر گولکنڈہ میں لشکر شاہی کا ملازم ہوا، پھر بیجاپور جا کر ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا .... ملک عنبر کی جوانی بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکن کی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا ... ۳۰ شعبان ۱۰۳۵ھ کو اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

(مرقع [illegible] سالگرہ نمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۵۰۱) جامعہ

"اسے اللہ! یہ پانی اس وقت تک جاری رکھ جب تک کہ اس پر ٹیکس لیا جائے۔ جس دن کوئیں پر ٹیکس وصول کیا جائے گا، اس کا مجھے ذمہ دار نہ ٹھہرا۔"

پن چکی کی نہر بھی اعلیٰ ترین ذہانت اور فن انجینیری کا اچھا نمونہ ہے۔ پانی پارے کی طرح ہوتی جیسا شفاف صدیوں سے خود بخود فلٹر ہوتا چلا آرہا ہے۔ جس وقت باباشاہ مسافرؒ نے اس سرزمین کو دیکھا، بے حد مسرور ہوئے اور پن چکی کو اپنا مسکن بنالیا۔ چوکور کنویں کو اس طرح قائم رکھکر باباشاہ محمودؒ نے، جو باباشاہ مسافرؒ کے خلیفہ تھے، ۱۲۱۷ء میں بڑا حوض بنوایا۔ اس حوض کے پہلو میں مشرقی سمت ایک سرنگ ہے، جسے سرنگ والا پل کہتے ہیں، لیکن اکثر لوگ اسے سرنگ تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سرنگ ہزاروں میل دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پہلے کے راجہ اور بادشاہ جنگی نقطۂ نظر سے اس طرح کی سرنگیں تعمیر کرواتے تھے۔ یہ پل زمین کے نیچے بنا ہوا ہے۔ اس پل کا خاص کمال یہ ہے کہ ایسے پل اس وقت تک تعمیر نہیں کئے جاتے تھے جب تک پانی کی خاصیت، بہاؤ کا رُخ اور اس کے ردعمل کی قوت سے آگاہی نہ ہو۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھکر سرنگ نما پل کی کمانیں بنائی گئی ہیں۔ دوسری کمانوں سے ندی کا پانی بہتا رہتا ہے۔ اس پل میں سے سیلاب کا پانی آسانی سے گذر جاتا ہے۔ حوض یا کنویں کو نقصان نہیں پہنچا۔ اس کا اصول جتنا سادہ ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ باہر سے سرنگ نما پل نظر نہیں آتا۔ اندر ایک لانبا حوض ہے جو قدیم گسٹ ہاؤس کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے، اس سے سرنگ نظر آتی ہے، یہ دوسو فٹ لمبی ہے۔ اس کی وجہ سے بڑا حوض اور سرنگ ایک سے معلوم ہوتے ہیں۔

بڑے حوض میں تیس یا چالیس فٹ کی بلندی سے آبشار کا صاف شفاف پانی گرتا رہتا ہے۔ اس کے معمار ایسے زبردست انجینئر تھے کہ پانی، طبعیات اور اس کے اصول سے پوری طرح واقف تھے۔ انھیں اس کا بھی علم تھا کہ پانی کے جھرنے اچانک اپنا رخ کب اور کیوں بدل دیتے ہیں۔ در اصل وہ لوگ زمین کے اندر گہری نہروں میں جھرنے نکال دیتے تھے۔ ... نے

یہ انوکھی اور ہمیشہ جاری رہنے والی نہر اسی اصول پر نکلوائی۔ آج تقریباً دو سو اٹھائیس سال سے شفاف پانی ظاہر ہو کر موصوف کے فیض جاری کی مانند یکساں گر رہا ہے۔ نہر کہاں سے اور کس طرح لائی گئی، یہ ایک سربستہ راز ہے۔ یہیں پر ایک عجیب و غریب نہر بھی تعمیر کی گئی ہے جو زمین کے سینے میں ہے، جس کی کوکھ سے پانی ظاہر ہو کر نکلتا ہے۔ اس پانی کی خاصیت یہ ہے کہ آنکھوں کی جلد بیماریوں سے مریض شفایاب ہو جاتا ہے۔ اس لئے اکثر لوگ یہاں کی آب و ہوا نیز قومی یکجہتی کی بنا پر ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہنا پسند کرتے ہیں۔

اس عجیب و غریب عمارت کو دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔ کیونکہ موتی جیسے پانی سے یہ لبالب بھری رہتی ہے۔ قیاس ہے کہ ایک چوتھائی زیر زمین بھی ایک "پن چکی" ہے۔ آج تک پتہ چلایا نہیں جا سکا کہ در حقیقت یہ کیا ہے۔ عام طور پر یہ بھی قیاس ہے کہ اس پن چکی کے آبشار کے پانی کا منبع نامعلوم ہے۔ متمنا مقام سے جو ایک پہاڑی ہے، جنواڑہ اور بی بی کے مقبرہ سے گذار کر کھام ندی سے لائی گئی ہے۔ اس نہر کی خوبی اور کمال یہی ہے کہ پانی کے منبع کا راستہ اس طرح رکھا گیا ہے کہ وہ زمین دوز تعمیر کے اندرونی حصے سے مل جائے تاکہ منبع سے نکلا ہوا اور نہر کے جھرنوں کا پانی جمع ہو کر آبشار کی شکل میں بہتا رہے۔ یہ نہر میلوں کسی نہ کسی ندی کے قریب بنائی گئی ہے تاکہ ایک ایک انچ کے فاصلے سے جھرنے نکلتے رہیں۔ نہر میں سے ایک گھوڑ سوار گذر سکتا ہے۔ [illegible] چھوٹی کمانوں میں بعض جگہ محراب نما مسجدیں بھی ہیں۔

بی بی کے مقبرہ سے سفید چونے اور ریت کے پائپ شروع ہو جاتے ہیں جو آبشار تک لگائے گئے ہیں۔ آبشار کے مغربی سمت کمانیں تعمیر کی گئی ہیں، ان کمانوں کے اندر راست ڈھلان میں یہی پائپ ہے جس کے منہ لمبے سے پانی لوہے کے بڑے بڑے پنکھوں سے ٹکراتا ہے۔ پانی کے ٹکراؤ سے پنکھے گردش کرنے لگتے ہیں۔ ان پنکھوں کو چھت کے نیچے فٹ کیا گیا ہے۔ چھت کے اوپر [illegible] ہے جس کا تعلق پنکھوں سے قائم کیا گیا ہے۔ آبشار [illegible] سے چکی بڑی تیزی سے گردش [illegible] اسی بنا پر اسے پن چکی کہا جاتا ہے۔ اس سے متصل [illegible]

اور ہوائی چکی بھی تھی، جو اس طرح برباد ہوگئی ہیں کہ اب ان کا ذکر بھی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

تین گنبد والی مسجدیں بہت کم ہیں، اورنگ آباد میں ایسی تین مسجدیں ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں شہنشاہ ہند اورنگ زیبؒ کی خصوص مسجد کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ دوسری جمیل بیگ کی مسجد تیسری سنگین مسجد۔ یہ دونوں مسجدیں پن چکی میں ہیں۔ جمیل بیگ خاں فوج کا سپہ سالار اور حضرت باباشاہؒ کا مرید تھا۔ اس مسجد کو شاہ محمود خلیفہ کی نگرانی میں تعمیر کیا گیا۔ اسی کے متصل جانب جنوب محمود دروازہ ہے۔ موصوف یہیں پر عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ یہ مسجد بے حد خوبصورت اور آٹھ پہلو ستون پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے پلاسٹر کا راز ابھی تک نامعلوم ہے۔ نہایت چمکدار بنفشئی اسپارکنگ استری کاری کی گئی تھی۔ اس کے تینوں گنبد خالص پتھر کی کرٹی دار سلوں سے بنائے گئے ہیں۔

مسجد سنگین بھی تین گنبدوں پر مشتمل ہے۔ یہ مسجد بلند و بالا برگد کے جنوب مغربی سمت میں بڑی دلکش ہے۔ اس مسجد کے مشرقی جانب طویل حوض ہے۔ اس مسجد کو ترکتاز خاں نے بنوایا تھا۔ مسجد کے اندر کا ایک حصہ قدیم زمانے کی تعمیر ہے۔ اس کے پلاسٹر میں یہ خوبی ہے کہ کئی صدیوں کے بعد بھی اس کی چمک میں فرق نہیں آیا۔ چاندکی چاندنی کی مانند اس کا دودھیا پلاسٹر آج بھی عجوبۂ روزگار ہے۔ مسجد کے سامنے کا حصہ بعد کی تعمیر معلوم ہوتی ہے کیونکہ دونوں کا فرق بہت نمایاں ہے۔ اندرونی نقش دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناگ پھن نکالے کھڑے ہیں۔ بغور دیکھیں تو خوبصورت بیل بوٹے نظر آتے ہیں۔ اسی مسجد کے مغربی سمت باباشاہ مسافرؒ اور باباشاہ سعید پلنگ پوش کے مزار ہیں۔ باباشاہ سعیدؒ کا وصال گلبرگہ میں ہوا تھا۔

باباشاہ مسافرؒ کی درگاہ فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اس کے ستون بڑے بڑے خالص پتھر کے تراشے ہوئے ہیں۔ نازک سی کمانیں بلاچھت کی ہیں جو سرخ رنگ کی ہیں۔ مسجد سنگین کے مشرق میں طویل حوض فواروں کی بہار دکھلاتا ہے۔ اس حوض کے نیچے گیسٹ ہاؤس ہے۔ اس کے اوپر حوض ہے اس لئے گرمیوں میں بے حد ٹھنڈا رہتا ہے۔ اس کے پہلو میں ندی محو خرام ہے۔ یہ ایرانی فن تعمیر

کا نمونہ ہے۔ اس حوض کی مثال پورے ایشیا میں نہیں ملتی۔ مسجد سنگین کے جنوب میں نگینہ حوض اور بارہ دری ہیں۔ بارہ دری برباد ہو کر خاموش احتجاج کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس بارہ دری کے نیچے تہہ خانہ ہے، جس کا راستہ کتب خانہ سے سرنگ کے ذریعہ ملایا گیا ہے۔ یہ سرنگ بھی جانے کہاں جا کر ختم ہوئی ہے۔ بارہ دری کا اب صرف چبوترہ رہ گیا ہے۔

پن چکی کی تعمیر اعلیٰ قسم کا ریاضی کی مرہون منت ہے۔ کوئی گوشہ اپنے فن و کمال سے محروم نظر نہیں آتا۔ بابا شاہ مسافرؒ کے مزار کے دروازہ پر کچھ اشعار تھے۔ بائیں طرف کے اشعار ہتھوڑی اور چھینی سے مٹا دئے گئے جو سونا بنانے کی کیمیا رسے لکھے گئے تھے۔ بہرحال پن چکی حقیقت میں پرسکون اور عافیت کی جگہ محسوس ہوتی ہے۔ اجنتا ایلورہ دیکھنے ساری دنیا سے لوگ آتے ہیں لیکن پن چکی میں آکر بے حد سکون اور طمانیت محسوس کرتے ہیں، جیسے کہتے ہوں یہ ہے ہمارے خوابوں کی سرزمین۔

اختر انصاری دہلوی

بہروپیا

(ایک ریڈیائی تمثیل)

افرادِ تمثیل: (۱) ایک نفسیاتی معالج (۲) ایک اعصابی مریض

(دیواری کلاک پانچ بجاتا ہے۔ گھنٹے کی پانچویں ضرب کے بعد ڈاکٹر کی آواز سنائی دیتی ہے)

ڈاکٹر: دیکھیے بات وہی ہے جو میں نے شروع میں کہی تھی۔ آپ تقریباً تین بجے آئے تھے اور اب پانچ بجے ہیں۔ ان دو گھنٹوں کی بات چیت اور پوچھ گچھ اور چھان بین کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کسی عارضے میں مبتلا نہیں ہیں۔ اگر کچھ ہے تو وہ تنہائی اور بیکاری کی پیداوار ہے۔ اس تنہائی کو دور کیجیے اور بیکاری کا علاج کیجیے۔ آپ اپنے آپ کو بالکل بھلا چنگا محسوس کریں گے۔ کیا سمجھے؟ —— بات اصل میں یہ ہے کہ یہ دُنیا ایک کاروباری منڈی ہے جو لین دین کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں کوئی چیز اجرت یا قیمت ادا کیے بغیر نہیں ملتی۔ اور سب سے زیادہ قیمت ہمیں جس چیز کی دینی پڑتی ہے وہ دو وقت کی روٹی ہے جو ہم کھاتے ہیں۔ اب اگر کسی کو یہ دو وقت کی روٹی ہاتھ پیر ہلائے بغیر ملتی ہے تو عام طور پر سمجھا تو یہی جاتا ہے کہ وہ شخص بڑا خوش قسمت ہے کیونکہ وہ روزی کمانے کے جھنجھٹوں سے آزاد ہے۔ مگر ایسا سمجھنا غلط ہے۔ اس شخص کو بھی اپنی دو وقت کی روٹی کی کچھ نہ کچھ قیمت کسی نہ کسی شکل میں ضرور ادا کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے لوگوں کو کچھ زیادہ ہی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کو ہاتھ پیر ہلائے بغیر کھانے کو ملتا ہے تو کچھ ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہاتھ پیر کی بجائے

دل اور دماغ بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ابھی آپ نے مجھے بتایا کہ آپ کوئی کام نہیں کرتے۔ نہ آپ کے لیے ضروری ہے کہ کوئی کام کریں۔ بظاہر یہ بڑی قابلِ رشک بات ہے۔ جو بھی سُنے گا اُس کو آپ کے اوپر رشک آئے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت آپ سے اس کی بہت بڑی قیمت وصول کر رہی ہے۔ بیکاری اور فرصت نے آپ کے لیے طرح طرح کے مسئلے پیدا کر دیے ہیں۔ آدمی بےکار رہ سکتا ہے مگر آدمی کا دماغ بیکار نہیں رہ سکتا۔ اگر اُس کے لیے کوئی جائز اور مفید مشغلہ نہ ہوگا تو وہ ناجائز اور غیر مفید مشاغل کا سہارا لینے پر مجبور ہوگا۔ یہی کچھ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور آپ کے مسئلے کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ کسی اہم کام میں مشغول ہو جائیں۔ اہم کام سے میرا مطلب ہے کوئی ایسی ذمہ داری جس کا بوجھ آپ کا دماغ ہر وقت محسوس کرے اور اِس طرح لایعنی افکار سے محفوظ رہے! بس یہی میری تشخیص ہے اور یہی وہ علاج ہے جو میں آپ کے لیے تجویز کرتا ہوں۔

(وقفہ)

ڈاکٹر: ہائیں! آپ تو منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔ بھئی آپ ماشاءاللہ ایک خوش حال اور تندرست نوجوان ہیں۔ خوش رُو بھی ہیں اور خوش پوش بھی۔ یہ سرخ و سپید رنگ، یہ دلکش و دل آویز نقوش، یہ مضبوط کاٹھی! قدرت نے آپ کو کس قدر فیاضی کے ساتھ نوازا ہے! پھر آپ کے چہرے پر اِس قدر افسردگی اور بے دلی کیوں؟ یہ تو ٹھیک نہیں!

(وقفہ)

ڈاکٹر: کیوں صاحب! کیا کہا میں نے؟ آپ نے میری بات کو سنا؟ (زیادہ نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے اور سمجھانے بجھانے کے انداز میں) دیکھئے میری بات مانیے۔ آپ بالکل تندرست ہیں۔ بیماری کے وہم کو دل سے نکال دیجئے۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ نفسیاتی مریض ہیں؟ نفسیاتی مریض بھلا ایسے ہوتے ہیں؟ میں نے آپ کے بدن کو خوب ٹھونک بجا کے دیکھ لیا۔ کہیں کوئی جسمانی یا عضوی خرابی نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ جسمانی صحت و تندرستی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ آپ کی دماغی حالت بھی بالکل اطمینان بخش ہے۔ ذہنی لحاظ سے آپ ایک قطعی نارمل انسان ہیں۔ کہیں کسی نفسیاتی خرابی یا عدم اعتدال

کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ آپ کی ذہانت کا معیار عام معیاروں سے کافی اونچا ہے۔ وہ جو ٹسٹ میں نے آپ کو دیا اس کا نتیجہ آپ سُن چکے ہیں۔ ذہانت کے ایسے معیار پر کوئی بھی شخص فخر کر سکتا ہے۔ تو پھر بھول جائیے اس بات کو کہ آپ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے کو کسی کام میں غرق کر دیں اور خالی وقت تنہائی میں گزارنے کی بجائے دوستوں کے ساتھ ہنسی خوشی میں گزاریں۔ آپ نے ایسا کیا تو کامیابی آپ کے قدم چُومے گی۔ بس جی کڑا کر کے نئے راستے پر چل پڑیے اور بھول جائیے خود کو بھی اور اپنے دماغی افکار کو بھی۔ یقین مانیے، ایک خوش و خرم زندگی اور ایک پُر بہار مستقبل آپ کے انتظار میں ہے۔

(وقفہ)

ڈاکٹر: کیا سمجھے آپ؟ میری رائے سے آپ کو اتفاق نہیں ہے کیا؟ —— اچھا یہ بتائیے، مَیں جو مشورہ آپ کو دے رہا ہوں اُس پر عمل کرنے میں آپ کو کیا دشواری محسوس ہوتی ہے؟

مریض: آپ کا مشورہ؟ میں تو آپ کے پاس مشورے ہی کے لیے آیا تھا ڈاکٹر صاحب! لیکن جو مشورہ آپ مجھے دے رہے ہیں وہ —— میرا مطلب ہے یہ مشورہ تو ہر شخص مجھے دیتا رہا ہے۔ بلکہ میں خود اپنے آپ کو یہ مشورہ دیتا رہا ہوں۔ سوال تو یہ ہے کہ میں اس مشورے پر کس طرح عمل کروں —— میرا مطلب ہے میں کس طرح اپنے افکار سے پیچھا چھڑاؤں۔ اور کس طرح خود کو کسی دوسرے کام میں مصروف کروں؟

ڈاکٹر: اپنی قوتِ ارادی سے کام لیجیے۔

مریض: (جھنجھلا کر جواب دیتے ہوئے) اپنی قوتِ ارادی سے کس طرح کام لوں؟ آپ مجھے وہ طریقہ بتائیے جس کے ذریعے میں اپنی قوتِ ارادی سے کام لوں اور اپنے ملعون خیالات کو دماغ سے جھٹک دوں۔ وہی طریقہ معلوم کرنے کے لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔

ڈاکٹر: جبر سے کام لیجیے! اپنے اوپر جبر کیجیے۔ جب فضول اور غیر صحت مند خیالات آپ کے دماغ پر حملہ آور ہوں تو اُن کو بے دردی کے ساتھ رد کر دیجیے۔ اُن کا بالکل کوئی نوٹس نہ لیجیے۔

مریض : اِس معاملے میں میرا دماغ کسی جبر کو قبول نہیں کرتا۔ میں خود کو بالکل بے بس پاتا ہوں۔ اور یہی وہ مرض ہے جس کے علاج کے لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مگر علاج تجویز کرنے کی بجائے آپ محض ایک بزرگانہ مشورہ دینے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ حد ہو گئی۔

ڈاکٹر: (ہنس کر) آپ کا مطلب ہے نالائقی کی حد ہو گئی۔

مریض : نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب ! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ میں دراصل ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں اور اکثر بات چیت میں گستاخانہ الفاظ میری زبان پر آجاتے ہیں۔ میں اس گستاخی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ للّٰہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ علاج تجویز کرنے کی بجائے محض یہ مشورہ عنایت فرما رہے ہیں کہ مجھے اپنا علاج خود کرنا چاہیے ـــــ ارے توبہ ! میں پھر گستاخانہ بات کہہ گیا۔ خدا کے واسطے ڈاکٹر صاحب ! مجھے معاف کر دیجیے !

(ڈاکٹر کے ہنسنے کی آواز)

ڈاکٹر : بھئی آپ کی گفتگو گستاخانہ ہو یا نہ ہو، لیکن کسی ذہنی مریض کی گفتگو ہرگز نہیں ہے۔ آپ کی ہر بات بلکہ آپ کا ہر نفسیاتی ردِ عمل آپ کے اس دعوے کو جھٹلاتا ہے کہ آپ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔

مریض : نہیں ڈاکٹر صاحب ! ایسا نہیں ہے۔ میں ہرگز وہم میں مبتلا نہیں ہوں۔ میرے دماغ کو جو روگ لگا ہوا ہے وہ کوئی وہمی و خیالی چیز نہیں ہے بلکہ ایک واقعاتی حقیقت ہے۔ یقین مانیے ڈاکٹر صاحب ! اس کو توہم سے ہرگز کوئی علاقہ نہیں ! اور یہ بھی تو سوچیے کہ اب جو میں آپ کے پاس آیا ہوں تو میرا کوئی دماغ تو خراب ہے نہیں یا میں کوئی پاگل تو ہوا نہیں ہوں کہ بے وجہ ڈاکٹر وں کے پیچھے بھاگا پھروں۔

ڈاکٹر : یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کا دماغ خراب نہیں ہے۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اور میں اتنی دیر سے کیا کہہ رہا ہوں۔

(دونوں کے ہنسنے کی آواز)

مریض : نہیں ڈاکٹر صاحب ! واقعہ یہ ہے کہ تنہائی میں میرا دماغ ایک پاگل کے دماغ کی

طرح کام کرتا ہے اور میں بالکل ایک پاگل کی طرح سوچتا ہوں۔

ڈاکٹر: آپ شاید یہ بات نہیں جانتے کہ کوئی پاگل اپنے آپ کو پاگل نہیں سمجھتا۔ اگر آپ کسی پاگل کو پاگل کہہ دیں تو وہ آپ کو مارنے کے لیے پتھر اٹھا لے گا اور آپ کو جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔

مریض: آپ صحیح فرماتے ہیں، لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ اچھا دیکھیے اب میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ میں یہاں سے جانے کے بعد کیا کروں گا۔

ڈاکٹر: یعنی؟ کیا مطلب؟

مریض: مطلب یہ کہ اس قسم کی ہر ملاقات کے بعد، خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، میرا دماغ جس طرح کام کرتا ہے اُس کا مجھے پورا تجربہ ہے اور اُس تجربے کی روشنی میں یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ سے رخصت ہو کر جب میں گھر پہنچوں گا تو مجھے لازمی طور پر کس ذہنی عمل سے گزرنا ہوگا۔

ڈاکٹر: اچھا کہیے۔

مریض: یہ جو دو ڈھائی گھنٹے آپ سے گفتگو ہوئی ہے، میں اس پوری گفتگو کو شروع سے آخر تک اپنے ذہن میں دہراؤں گا۔ اور گفتگو کے دوران میں جن جن مقامات پر مجھے کوئی الجھن محسوس ہوئی اُن مقامات کو دریافت کروں گا، اور اُن کو انگلیوں پر گنوں گا اور ایک فہرست مرتب کر لوں گا۔

ڈاکٹر: کیسی الجھنیں؟ میں سمجھا نہیں۔

مریض: دیکھیے نا۔ گفتگو کے دوران میں میرا ذہن بعض دوسری چیزوں کی طرف بھی منتقل ہوتا رہا اور مجھے بعض دوسری باتیں بھی یاد آتی رہیں۔ اب گفتگو کے دوران میں تو میں آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جناب! ذرا ٹھیریے! میں کچھ الجھن سی محسوس کر رہا ہوں اور میرا ذہن کسی دوسری بات کی طرف جا رہا ہے۔ میں اس الجھن کو سلجھا لوں، اُس کے بعد گفتگو آگے بڑھے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ بات چیت ہوتی رہی اور پے بہ پے الجھنیں بھی پیدا ہوتی رہیں۔ اب میں گھر پہنچ کر اُن سب الجھنوں کو یاد تازہ کروں گا اور ان کو سلجھانے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر: آپ یہ کوشش کیوں نہ کریں کہ اُن الجھنوں پر خاک ڈالیں اور ان کو بھلا کر دوسرے

کام میں لگ جائیں۔

مریض : یہی تو میں نہیں کر سکتا اور اسی مصیبت کے علاج کے لیے تو میں یہاں آیا ہوں۔ اچھا خیر آگے سنیئے۔ گفتگو کے دوران میں بعض مقامات پر مجھے اظہارِ مطلب میں دشواری محسوس ہوئی اور صحیح الفاظ دماغ کے خزانے سے برآمد ہو کر زبان تک نہیں آئے۔ ایسے تمام مقامات اور الفاظ کی بھی میں ایک فہرست مرتب کروں گا۔ پھر بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں میں نے مافی الضمیر کو بڑی عمدگی اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ ان مقامات کو بھی کھود کر نکالوں گا اور ان کی بھی ایک فہرست مرتب کروں گا۔ اِس طرح متعدد فہرستیں تیار ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر: پھر اِن فہرستوں کی ایک فہرست ؟

مریض : جی نہیں۔ پھر ان فہرستوں کو بار بار دہراؤں گا۔ جب وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں گی تو اُن میں مزید با قاعدگی اور تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب! میری اس گفتگو سے آپ کو کوفت تو نہیں ہو رہی ہے ؟ میرا مطلب ہے، آپ اِن باتوں کو سُنتے سُنتے اُکتا تو نہیں گئے ؟

ڈاکٹر : نہیں بالکل نہیں۔ آپ کہے جائیے بلکہ ہر بات کو خوب کھول کر بیان کیجیے۔ میں پوری توجہ سے سُن رہا ہوں۔

مریض : کیا کروں ڈاکٹر صاحب! یہی وہ خرافات ہے جو میرے دماغ میں بھری رہتی ہے اور جس سے میں کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ خیر، تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ اُن فہرستوں کو مرتب کرنے کے بعد میری یہ کوشش ہو گی کہ اُن میں مزید با قاعدگی اور تنظیم پیدا ہو۔ مطلب یہ کہ اگر کسی ایک فہرست میں پانچ چیزیں ہیں، دوسری میں چھ، تیسری میں آٹھ اور چوتھی میں بھی آٹھ، تو میں یہ کوشش کروں کہ تیسری فہرست صرف سات چیزوں پر مشتمل ہو۔

ڈاکٹر : میں نہیں سمجھا۔ اس کو دوبارہ بتائیے۔

مریض : دیکھیے نا، ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ میں نے کُل چار فہرستیں مرتب کیں، حالانکہ حقیقت میں ان فہرستوں کی تعداد چار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ خیر فرض کیجیے کہ چار فہرستیں وجود میں

آگئیں۔ اب پہلی فہرست میں تو کُل پانچ چیزیں ہیں، دوسری میں چھ ہیں، اور تیسری اور چوتھی میں آٹھ آٹھ ہیں۔ یعنی سات کسی میں نہیں ہیں۔

ڈاکٹر: اچھا! پہلی فہرست میں پانچ، دوسری میں چھ — سات کسی میں نہیں! — تیسری میں آٹھ اور چوتھی میں بھی آٹھ! اچھا پھر؟

مریض: تو اب میری کوشش یہ ہوگی کہ تیسری فہرست میں آٹھ کی بجائے صرف سات چیزیں ہوں۔ تاکہ پانچ، چھ، سات اور آٹھ کے سہارے مجھے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔

ڈاکٹر: اچھا میں سمجھا۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ پانچ، چھ، سات اور آٹھ میں جو حسابی ترتیب ہے اُس کی مدد سے آپ کو یاد رکھنے میں آسانی ہوگی۔ اچھا اس کے بعد آپ کیا کریں گے؟

مریض: بس اس کے بعد میں تیسری فہرست میں سے ایک چیز کم کر دوں گا تاکہ آٹھ کی بجائے سات چیزیں رہ جائیں، اور اس طرح مجھے مطلوبہ تنظیم حاصل ہو جائے گی۔ یعنی پہلی فہرست میں پانچ چیزیں، دوسری میں چھ، تیسری میں سات اور چوتھی میں آٹھ!

ڈاکٹر: ٹھیک ہے۔ اُس کے بعد کیا؟

مریض: اُس کے بعد میں اِن فہرستوں کو حرزِ جاں بنالوں گا۔ اُن کو بار بار دہراؤں گا گویا کوئی وظیفہ گھوٹ رہا ہوں اور اس کے بعد مطمئن ہو کر سو جاؤں گا۔ دوسرے دن اولین فرصت میں ان کی یاد کو از سرِ نو تازہ کروں گا۔ علاوہ ازیں دوسرے دن کی نئی الجھنیں بھی وجود میں آ چکی ہوں گی۔ اُن کا سلجھانا اور ان سے نپٹنا بھی ضروری ہوگا۔

ڈاکٹر: اچھا!

مریض: جی ہاں، اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ فہرستوں اور فارمولوں اور مختلف امور اور واقعات کے مجموعوں کا ایک ہمالیہ پہاڑ تعمیر ہوتا چلا جائے گا۔ اس سارے ذہنی عمل کے دوران میں اگر کچھ پڑھوں گا تو اُس مطالعے کی بنا پر بھی کچھ فہرستیں تیار ہو جائیں گی۔ اگر کسی کا خط آئے گا تو اُس خط کے مندرجات کو بھی ایک فارمولے کی شکل میں محفوظ کرنے

کی کوشش کروں گا۔ اگر کسی شخص کے ساتھ کسی خاص موضوع پر کوئی بحث آرائی ہوگی تو یہ ساری بحث تنہائی میں ایک مکمل ذہنی تبصرے کا موضوع بنے گی جس کے نتیجے میں اصول یا نظریات کا ایک مخصوص ڈھانچہ وجود میں آئے گا، اور اُس کو بھی اپنے ذہنی و فکری مواد کا ایک مستقل جزو بنانے کی کوشش کروں گا

....

ڈاکٹر: حد ہوگئی۔

مریض: مطلب یہ ہے ڈاکٹر صاحب! کہ اِس دنیا کے ادنیٰ ترین معاملات اور ارذل ترین اشیا سے لیکر ادب، سائنس اور فلسفے کے اعلیٰ ترین مسائل تک کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو میرے اس مخصوص ذہنی عمل کے دائرے میں نہ آتی ہو۔ اس ذہنی عمل کے تحت مجھے حقیر ترین چیز بھی اعلیٰ ترین معلوم ہوتی ہے اور میں کسی حال میں اُس کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اور یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کوئی بڑی سے بڑی مصروفیت اور اہم سے اہم ذمہ داری مجھے اِس ذہنی کارروائی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سارا ذہنی عمل ایک قطعی مہمل، لغو، فضول اور دور از کار چیز ہے میں اِس کو رد کرنے پر قادر نہیں ہوں......

ڈاکٹر: اچھا فرض کیجیے کہ آپ کو اس ذہنی عمل کی مہلت ہی نہ دی جائے۔ یعنی یہاں سے رخصت ہوکر جب آپ گھر پہنچیں تو اپنے آپ کو ایک فوری اور شدید ذہنی و عملی مصروفیت سے دوچار پائیں۔ مثلاً گھر پہنچتے ہی آپ کو معلوم ہو کہ باہر سے دو تین خاص دوست رات کی گاڑی سے آرہے ہیں۔ آپ کو فوراً اسٹیشن پہنچنا ہے، اُن کو گاڑی سے اُتار کر گھر لانا ہے، ان کے قیام و طعام کا انتظام کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو پھر آپ کیا کریں گے؟

مریض: (نہایت اطمینان اور وثوق کے ساتھ) کچھ نہیں۔ جب تک یہ خارجی مصروفیت رہے گی میرا وہ ذہنی فریضہ ملتوی رہے گا۔ لیکن پھر اولین فرصت کے حاصل ہوتے ہی میں اپنے فرض سے سبک دوش ہونے کی کوشش کروں گا ــــ آپ کچھ سوچ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! سر جھکائے

ہوئے اور آنکھیں بند کیے ہوئے!

ڈاکٹر: نہیں آپ اس کا خیال نہ کیجیے۔ میں سب سُن رہا ہوں۔

مریض: ڈاکٹر صاحب! میں نے اپنے ذہنی خلفشار کی جو تصویر ابھی پیش کی وہ بہت سادہ تصویر ہے۔ اُس سے اُن پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا جن سے دراصل مجھے سابقہ رہتا ہے۔ میری ساری ٹریجڈی یہی ہے کہ میں اپنی ظاہری ہیئت سے، بات چیت سے، عادات و اطوار اور نشست و برخاست سے ایک تندرست اور صحت مند آدمی معلوم ہوتا ہوں، لیکن میرے دماغ میں ایک عجیب قیامت برپا رہتی ہے۔ گویا دماغ نہیں ہے، کوئی پکا پھوڑا ہے جو کھولتے ہوئے لاوے سے پُر ہے۔ جو لوگ میرے خارج کو دیکھتے ہیں اُن کو گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ کیسے کیسے سانپ بچھو اور کنکھجورے میرے اندرونی وجود سے لپٹے ہوئے ہیں اور اُسے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ بارہا میرے دل سے یہ دعا اُٹھتی ہے کہ خدا کرے میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں اور کسی پاگل خانے میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار کر مر جاؤں۔ یا کم سے کم اِتنا ہی ہو کہ میرے حواس کند اور میرا حافظہ معطل ہو جائے تاکہ یہ جو ہر وقت ہر چیز کو کریدنے، ہر بات کو ٹٹولنے اور ہر امر کا تجزیہ کرنے کا مرض ہے اِس سے تو نجات پاؤں۔ آپ شاید سو گئے ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: نہیں بھئی، میں آپ کی بات پوری توجہ سے سُن رہا ہوں۔ کہے جایئے۔

مریض: میں جب کسی بے پروا، کھلنڈرے اور ہنسنے ہنسانے والے شخص کو دیکھتا ہوں اور اُس کی حالت سے اپنی حالت کا موازنہ دل ہی دل میں کرتا ہوں تو میرے کلیجے پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ یقین مانیے گا ڈاکٹر صاحب! میں سچ مچ مرنے کی دعائیں مانگنے لگتا ہوں، اور لطف یہ ہے کہ لوگ مجھے دن رات یہی مشورہ دیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت زندہ دل دوستوں کی صحبت میں گزارو۔ خدارا مجھے بتایئے کہ میں اِس عذاب سے کس طرح چھوٹوں۔ مجھے تو جیتے جی جہنم میں دھکیل دیا گیا ہے——
آپ کیا سوچ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟

(وقفہ)

ڈاکٹر: (جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہو کر) ہوں! ـــــ آپ نے بتایا تھا کہ آپ روزانہ ورزش بھی کرتے ہیں۔ تو کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ گھر پر ورزش کرنے کی بجائے آپ گھر سے باہر ہواخوری کے لیے جایا کریں؟

مریض۔ مَیں ایک زمانے میں ہواخوری کے لیے بھی جاتا رہا ہوں۔ لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر: نہیں، محض ہواخوری کے لیے جانا کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ برسک واکنگ کریں اور واک زیادہ سے زیادہ لمبی ہو۔ ہانپتے ہوئے جائیں اور ہانپتے ہوئے واپس آئیں۔ اور حتی الامکان طلوعِ آفتاب سے قبل واپس آجائیں۔ مزید برآں جس راستے سے جائیں اس راستے سے واپس نہ آئیں۔ واپسی کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں۔

(وقفہ)

ڈاکٹر: ارے! آپ پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ (لہجے میں مزید نرمی پیدا کرتے ہوئے) دیکھیے، میری خواہش اصل میں یہ ہے کہ آپ روزانہ کم سے کم دو تین گھنٹے کسی ایسی مصروفیت میں گزاریں جو شدید قسم کی ذہنی و عملی مصروفیت ہو۔ آپ اُس میں پورے طور پر جذب ہو جائیں اور اپنے تیس سال پرانے وجود کو بالکل بھول جائیں۔ آپ نے اپنی عمر تیس سال بتائی تھی نا؟

مریض: جی ہاں، لیکن اس چہل قدمی اور ہواخوری سے مجھے کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں ہے۔

ڈاکٹر: یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ بشرطیکہ آپ ان باتوں کو ملحوظ رکھیں جو میں نے ابھی بتائیں۔ آپ چند روز تجربہ کر کے تو دیکھیے ـــــ اچھا بتائیے کہ آپ سینما وغیرہ دیکھتے ہیں؟

مریض: جی برابر دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر: دو تین گھنٹے پکچر ہاؤس میں گزارنے کے بعد آپ کو کوئی خاص تازگی محسوس ہوتی ہے؟

مریض: جی نہیں، کوئی تازگی محسوس نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات تو کچھ پرانی الجھنیں از سرِ نو تازہ ہو جاتی ہیں جن کو تنہائی ملتے ہی سلجھانا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر: ظاہر ہے کہ آپ پکچر کے دوران میں بھی اپنے اندر ہی غرق رہتے ہیں۔ آپ کو خود

آپ کے اپنے وجود سے الگ کرنے کے لیے کسی شدید تر کارروائی کی ضرورت ہے!

مریض: جی؟ کیا فرمایا؟

ڈاکٹر: کچھ نہیں۔ یہ بات تو دراصل میں نے اپنے آپ سے کہی ——— (پھر ذرا چونک کر) اچھا یہ بتائیے، آپ نے نٹ راج دیکھا ہے؟

مریض: (اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے) جی؟

ڈاکٹر: میرا مطلب ہے نٹ راج سینما جو متھرا روڈ پر ہے۔ وہاں کچھ دنوں سے رقص و موسیقی کا ایک ملا جلا پروگرام ہو رہا ہے۔ باہر سے کوئی ٹروپ آیا ہوا ہے جس نے سارے شہر کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ لوگ ہنستے ہنستے پاگل ہو جاتے ہیں۔ آپ ذرا ایک دن وہ شو تو دیکھیے۔ بلکہ مسلسل کئی دن تک دیکھیے۔

مریض: ارے ڈاکٹر صاحب! آپ پھر مذاق کرنے لگے۔ بھلا ان باتوں سے کسی مریض کا علاج ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر: نہیں بھائی میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہ بات پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ آپ وہاں جائیں گے اور تین گھنٹے تک قہقہے لگائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہنسنے ہنسانے سے کتنے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور اس کا دماغی صحت سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

مریض: چھوڑیے بھی ڈاکٹر صاحب! کوئی کام کی بات بتائیے۔

ڈاکٹر: یقین مانیے، میں بہت کام کی بات بتا رہا ہوں۔ (کسی قدر جوش میں آ کر) آپ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ یہ جو دنیا میں چاروں طرف افسردگی اور پژمردہ دلی اور بے لطفی اور بدمزگی کا ایک طوفان سا نظر آتا ہے، وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسانوں نے ہنسنا ہنسانا ترک کر دیا ہے، اور قہقہہ زنی کو ایک غیر سنجیدہ اور اوباشانہ حرکت خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا ضرورت سے زیادہ متین ہو گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قہقہہ مار کر ہنسنا نہ صرف ایک جسمانی ورزش ہے بلکہ دل، دماغ اور روح کی ورزش بھی ہے۔ آپ اس چیز سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجیے اور اس کو اپنے مرض کا علاج سمجھیے۔

مریض: معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب! مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر: سنیے! آپ نے کبھی اِس حقیقت پر غور کیا ہے کہ تمام انسانی افعال میں صرف ہنسنا ہی ایک ایسا فعل ہے جو خالص انسانی وصف ہے اور حیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔ آپ نے کبھی کسی جانور کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا ہوگا! ہنسنے کے علاوہ باقی تمام افعال انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہیں۔ حتیٰ کہ عقل بھی جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ یعنی وہ چیز بھی جس کو انسان کا نفسِ ناطقہ خیال کیا گیا ہے اور جو تمام انسانی ترقیوں کی بنیاد ہے۔ کیا اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہنسنا انسان کے لیے نہایت ضروری ہے؟

مریض: بے شک ضروری ہے، لیکن......

ڈاکٹر: لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ آج رات ہی نٹ راج کا شو دیکھیے۔ شو کے خاتمے پر آپ ہال سے باہر آئیں گے تو ایک مختلف انسان ہوں گے۔ آپ کی دنیا بدل چکی ہوگی۔ اور آپ کے دماغ کو جو روگ لگا ہوا ہے وہ دھواں بن کر اڑ چکا ہوگا۔ کیا سمجھے آپ؟ وہ ٹروپ بہترین فن کاروں کا مجموعہ ہے۔ اور ٹروپ لیڈر کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہوسکتا۔ وہ دنیا کا بہترین مسخرہ ہے۔ اس سے بڑا کامیڈین آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ اس سیاہ فام بھُتنے کی کارگزاری ذرا جاکر تو دیکھیے۔ ہنستے ہنستے آپ کا بُرا حال ہوجائے گا۔ آپ جس گھٹن کا شکار ہیں وہ دھواں بن کر اُڑ جائے گی۔ جی!

مریض: للّٰہ ڈاکٹر صاحب! کوئی علاج تجویز کیجئے! مجھے ہنسنے ہنسانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جس کو بھوک ہی نہ ہوگی وہ نانبائی کی دوکان پر بھی کیوں جائے گا؟ میں وہاں کاہے کے لیے جاؤں؟ ہنستے ہوئے لوگ مجھے زہر معلوم ہوتے ہیں۔ میں ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

ڈاکٹر: نہ سہی! لیکن اس بہروپیے سے آپ ضرور ملاقات کیجیے۔ وہ کالا کلوٹا بد ہیئت آدمی آپ کو بدل کر رکھ دے گا۔ ایک دنیا اس کے کرتبوں پر فریفتہ ہو رہی ہے۔ آپ بھی اُس کے سحر سے نہیں بچیں گے —— اچھا ایک کام کیجئے۔ آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں آپ کو آج ہی اپنے ساتھ لے چلوں گا——

مریض: نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے معاف رکھیے ــــ میں چلتا ہوں ــــ حد ہوگئی!

ڈاکٹر: ارے نہیں۔ بیٹھے رہیے۔ آپ تو سچ مچ اٹھ کھڑے ہوئے ـــ ذرا بیٹھیے تو۔ ہاں، یوں۔ بھئی اب تو آپ کو میری بات ماننی ہی پڑے گی۔ میں آپ کو اپنے ساتھ ضرور لے چلوں گا ــــ لیجیے ابھی دو سیٹیں بک کراتا ہوں۔

(ٹیلیفون کھسکائے جانے کی آواز)

مریض: خدا کے واسطے ڈاکٹر صاحب! مجھے معاف رکھیے۔ میں نہیں جاؤں گا ــــ آپ بیکار فون کر رہے ہیں۔

(فون پر نمبر ملانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ڈاکٹر: ہیلو!

مریض: اوفوہ ڈاکٹر صاحب! اب میں آپ سے کیسے کہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ــــ میں خود ہی وہ مسخرہ ہوں!

ڈاکٹر: جی!

مریض: جی ہاں، میں ہی وہ شخص ہوں جس سے آپ میری ملاقات کرانا چاہتے ہیں!

ڈاکٹر: یعنی؟ کیا مطلب؟

مریض: مطلب یہی کہ وہ شخص جسے آپ سیاہ فام بھتنا کہہ رہے ہیں میں ہی تو ہوں!

ڈاکٹر: (سخت حیرت کے لہجے میں) آپ؟

مریض: جی جی وہ بہروپیا یہی خاکسار ہے۔

ڈاکٹر: یعنی نٹ راج ٹروپ کے لیڈر آپ ہی ہیں! آخر یہ کیسے ممکن ہے؟ ــــ بھئی حد ہوگئی! اور آپ تو یہ کہہ رہے تھے کہ میں کوئی کام نہیں کرتا اور بڑے بھائی کے سہارے زندگی بسر کرتا ہوں؟

مریض: وہ میں نے غلط نہیں کہا۔ میرے بڑے بھائی اُس ناٹک منڈلی کے مالک ہیں۔ میں

تھوڑی سی دیر اسٹیج پر مسخرہ پن کرکے ان کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ تو یہ تو کوئی کام نہیں ہوا۔

ڈاکٹر: مگر مجھے واقعی حیرت ہے کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کا میں ذکر کرتا رہا ہوں۔ واللہ حد ہوگئی۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

مریض: آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ لیکن وہ شخص دراصل میں ہی ہوں۔ اور اب آپ خدا کے لیے میرے علاج کی طرف توجہ فرمائیں۔ (گلوگیر آواز میں) واللہ میں بہت دکھی ہوں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں!

ڈاکٹر: ہائیں ہائیں اِس قدر دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنے آنسو پونچھیے اور مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیجیے۔ کس قدر عجیب بات ہے! میں آپ کو خود آپ ہی سے ملانے لے جا رہا تھا!

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

ترجمان القرآن (جلد سوم) از مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

سائز $\frac{18\times22}{8}$ ، حجم ۹۹۲ صفحات ، مجلد مع گرد پوش ، طباعت ٹائپ میں ، قیمت: ۴۲ روپئے

سال اشاعت ؛ ۱۹۶۸ء ، ناشر: ساہتیہ اکاڈمی ، رابندر ابھون ، نئی دہلی ملے

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مقبول ترین تفسیر، ترجمان القرآن کی دو جلدیں، مولانا آزاد کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں، مگر ساہتیہ اکاڈمی نے، جس نے مولانا آزاد مرحوم کی جملہ کتابوں کو از سر نو شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے، پانچ جلدوں میں تقسیم کیا ہے، دو جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، جن پر حسب ترتیب دسمبر ۱۹۶۵ء اور اگست ۱۹۶۰ء میں رسالہ جامعہ میں تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسری جلد ہے جس میں سورہ بقرہ سے سورہ انعام تک کا ترجمہ اور تفسیر شامل ہے۔ حسب سابق اس میں حواشی (مولانا آزاد کے حواشی کے علاوہ) اور اشاریہ کا اضافہ کیا گیا ہے پچھلی دونوں جلدوں کی طرح یہ جلد بھی مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حاشیے اور اشاریہ کس نے مرتب کیے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر ہند و پاک کے ان چند ممتاز لوگوں میں سے ہیں، جنھیں مفکر اسلام کا درجہ حاصل ہے، مگر اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے وہ فکر و اجتہاد کے میدان میں ملک و قوم کی رہنمائی کا حق ادا نہ کر سکے، صرف "ترجمان القرآن" اور ان کے مختلف مضامین میں ایسے

نمونے ملتے ہیں جن سے ان کے فکر و اجتہاد کی غیر معمولی صلاحیتوں اور ان کے طرزِ فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ "ترجمان القرآن" کی تصنیف کے وقت مولانا آزاد کے پیشِ نظر صرف اس قدر تھا کہ "قرآن کے مطالعہ و تعلیم کے لیے ایک درمیانی ضخامت کی کتاب مہیا ہو جائے، مجرد ترجمے سے وضاحت میں زیادہ، مطوّل تفاسیر سے مقدار میں کم" لیکن مولاناؒ جب لکھنے بیٹھتے تو انھیں اپنے قلم پر مشکل سے قابو حاصل ہوتا تھا اور معلومات کا دریا بے قابو ہو کر بہہ نکلتا تھا۔

"ترجمان القرآن" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اطناب اور تفصیل سے بچنے کی بار بار کوشش کرتے ہیں، مگر پھر بھی کوئی خاص نکتہ سامنے آجاتا ہے تو صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ جلد میں ایسے بہت سے موضوعات ہیں، جن پر مولانا نے اگرچہ چند صفحے لکھے ہیں، مگر وہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے کتابوں پر بھاری ہیں مثلاً سورہ توبہ کی تفسیر میں زکوٰۃ یا منافقوں کے اعمال و خصائص کے سلسلے میں یا سورہ یونس کی تفسیر میں "کائنات کا چھ ایام میں پیدا ہونا" اور "قرآن اور آخرت کی زندگی" کے عنوانات کے ماتحت جو کچھ لکھا ہے یا سورہ یوسف کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں، وہ مولانا آزاد کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ مولاناؒ نے اپنے مطالعہ کے بارے میں خود لکھا ہے:

> "کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے لئے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے، اس کی ایک ایک سورۃ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں طے کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علومِ قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔"
>
> علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا ہے اور جو کچھ جدید ہے اس کے لئے اپنی راہیں آپ نکالیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی کھلی

ہیں، جس طرح قدیم راہوں کے چپہ چپہ کا شناسا ہوں :

رہا ہوں رند بھی میں اور پارسا بھی میں

مری نظر میں ہیں رندان و پارسا اک ایک

ترجمان القرآن جلد اول (قدیم ایڈیشن) ص۳۵

امید ہے کہ مولانا آزاد کی دوسری کتابوں کی طرح اسے بھی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

(عبداللطیف اعظمی)



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے | قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۶۲	بابت ماہ ستمبر ۱۹۷۰ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

●

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

۲۲ راگست کو ضیاء الحسن فاروقی صاحب کی طبیعت یکایک خراب ہوگئی۔ وہ سہ پہر میں ایک جلسے میں شرکت کے لیے گھر سے روانہ ہوئے، راستے میں سینے میں کچھ درد محسوس کیا، اسی حالت میں دفتر تشریف لائے، ٹھنڈا پانی پیا اور طبیعت بحال ہوگئی، مگر تھوڑی ہی دیر میں طبیعت پھر خراب ہوئی اور انھیں فوراً ہی ہسپتال پہنچایا گیا۔ اسی وقت گلوکوز اور آکسیجن دی گئی اور کارڈیوگرام لیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتلایا کہ انھیں قلب کا شدید دورہ اٹھا تھا، جس کا دل پر گہرا اثر ہے۔ اس بات کو آج چار روز ہوگئے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے اور مناسب علاج کی وجہ سے اب خطرہ جاتا رہا ہے اور صحت رفتہ رفتہ بہتر ہورہی ہے، مگر اب بھی مکمل آرام اور بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور غالباً کچھ عرصے تک ہسپتال میں رہنا ہوگا اور معمول کے مطابق کام کرنے کی اجازت تو شاید مہینوں کے بعد ملے۔ قارئین جامعہ سے درخواست ہے کہ وہ موصوف کی مکمل صحت کے لئے دعا کریں۔ ہم ان حضرات کا جنھوں نے موصوف کی صحت اور خیریت معلوم کرنے کے لیے خطوط لکھے ہیں، تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مجھے ہسپتالوں کا اچھا خاصا تجربہ ہے، اچھے اسپتالوں میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی پرخلوص خدمات کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ضیاء صاحب کی اس علالت کے زمانے میں ہولی فیملی ہسپتال میں جو ایک امریکن مشن کے زیرِ انتظام ہے، نرسوں کے کام کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ان کی محنت، چستی اور فرض شناسی کو دیکھکر بے حد خوشی ہوئی، اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر ملال اور افسوس ہوا کہ ہم مسلمانوں نے نہ جانے کیوں خدمت خلق کے اس اہم کام کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بڑے سرمایہ داروں کی یقیناً بہت کمی ہے، تاہم اب بھی کئی ایسے شہر ہیں جن کے مسلمان اچھے خاصے خوش حال ہیں اور وہ کم سے کم ایک ہسپتال تو قائم ہی کرسکتے ہیں، اور اگر مان لیا جائے کہ ان کی مالی حالت کوئی ہسپتال قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو مسلمان لڑکیاں اگر کلرکی کرسکتی ہیں تو نرس کا کام بھی کرسکتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری جماعت کو اس کام سے نفرت ہے چنانچہ شاید ہی کسی ہسپتال میں کوئی مسلمان نرس ملے گی۔ اسی سال کا واقعہ ہے۔ جامعہ کی ایک گریجویٹ مسلمان خاتون شیخ الجامعہ صاحب سے ملازمت اور کام کے سلسلہ میں ملیں اور انھوں نے نرسری کی معلمی کی ٹریننگ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ شیخ الجامعہ صاحب نے معلوم کیا کہ کیا وہ نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنا پسند کریں گی تو انھوں نے اس طرح انکار کیا جیسے یہ بہت ہی پست اور ذلیل کام ہے۔ یہ طرز فکر صرف ان ہی خاتون کا نہیں ہے، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو شاید پوری ملّت کا ہے۔ ہماری اجتماعی خامیوں اور خرابیوں کی اصلاح کی طرف مختلف طریقوں سے توجہ دلائی جارہی ہے، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ہسپتال کے قیام اور نرسنگ کی ٹریننگ کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں دلائی گئی ہے، حالانکہ رفاہ عام اور خدمت خلق کے لیے، جسے اسلامی تعلیمات میں بڑی اہمیت دی گئی ہے اور جس سے مسلمانوں کو اپنے عہد عروج میں بہت شغف رہا ہے، اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اللہ کے تمام بندوں کی، چاہے وہ کسی طبقے یا کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں، بے لوث اور بے غرض خدمت کی جاسکتی ہے۔ خدا وہ دن لائے جب ہماری قوم کو اس مفید اور اہم ضرورت کا بھی احساس ہو اور یہ احساس عمل کی صورت اختیار کرے۔

جامعہ کے جشن زریں کا ان صفحات میں کئی مرتبہ ذکر آچکا ہے۔ اب طے ہوگیا ہے کہ ۲۸ اکتوبر سے یکم نومبر تک پانچ دن یہ جشن منایا جائے گا۔ جوبلی کے افتتاح کے لیے، نائب صدر جمہوریہ، جناب گوپال سروپ پاٹھک سے، جلسۂ یوم تاسیس میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کرنے اور جلسہ سے خطاب کرنے کے لیے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے اور جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر سندیں دینے اور خطبہ پڑھنے کے لیے صدر جمہوریہ عالی جناب وی وی گری سے درخواست کی گئی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ان معززین نے ہماری درخواست کو منظور فرمالیا ہے۔ ان تین اہم جلسوں کے علاوہ اور بہت سے پروگرام ہیں جو اپنی افادیت اور عام دلچسپی کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً بعض اہم مسائل پر سمپوزیم کیے جائیں گے، تعلیمی اور علمی نمائشیں کی جائیں گی، مفید اور دلچسپ ڈرامے ہوں گے۔ غرض یہ پانچ دن ایسے ہوں گے، جن میں جامعہ اپنے کاموں کا جائزہ لے گی، اپنی خدمات کو قوم کے سامنے پیش کرے گی، اصحاب علم اور دانش ورقومی اور ملکی مسائل پر بحث وگفتگو کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ ایسی شائستہ تفریحات کا سامان بھی ہوگا، جن میں چھوٹے بڑے سب شریک ہوسکیں اور لطف اٹھاسکیں۔ انشاء اللہ مفصل پروگرام بہت جلد مختلف اخبارات میں شائع کردیا جائے گا۔

ہماری ایک خواہش یہ بھی ہے کہ اس اہم موقع پر ماہنامہ جامعہ کا ایک خاص نمبر شائع کریں جس میں جامعہ کے تمام شعبوں کا اختصار کے ساتھ تعارف ہو، جامعہ کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اور جامعہ کے معماروں اور خادموں کو یاد کیا جائے۔ یہ خاص نمبر اکتوبر اور نومبر کے دو شماروں پر مشتمل ہوگا اور حجم کوئی ڈیڑھ دو سو صفحات ہوگا۔

یہ تو ہوئے ہمارے ارادے اور حوصلے، اب سوال ہے کہ خود قوم کی کیا ذمہ داری ہے؟ وہ جامعہ سے کیا توقعات رکھتی ہے اور ان توقعات کی تکمیل کے لیے خود کیا کرنا چاہتی ہے؟

جامعہ کو جب سے حکومت کی امداد مل رہی ہے، اس کے روزمرہ کے کام خوش اسلوبی سے انجام پا رہے ہیں اور تعمیرات اور توسیع کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مشکلات اور رکاوٹیں ضرور پیش آتی رہتی ہیں، مگر بہرصورت ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے مگر بہت سے کام ہیں جن کے لئے حکومت سے مدد نہیں مل سکتی، اس سلسلے میں ہم نے قوم سے تین اپیلیں کی ہیں، ایک اسکول کی عمارت کی تکمیل کے لئے، جو ایک طویل عرصے سے نامکمل ہے اور قوم و ملک کی بے توجہی کی مرثیہ خواں ہے، دوسری اسکالرشپ فنڈ کے لیے، تیسری مسجد کی تعمیر کے لیے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قوم نے ان تینوں اپیلوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے۔ اب بھی وقت باقی ہے، امید ہے کہ مخیر اور علم دوست حضرات اس طرف توجہ کر کے جوبلی کا ایک بڑا مقصد پورا کرنے میں تعاون فرمائیں گے۔

---

۱۵ اگست کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے جن اصحاب علم کو اعزازات ملے ہیں، ان میں دار المصنفین کے ناظم اعلیٰ حاجی شاہ معین الدین ندوی بھی ہیں۔ موصوف نے واقعی علم و ادب کی جو غیر معمولی خدمت کی ہے اس کے پیش نظر صحیح معنی میں وہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں تمام اہل جامعہ اور بالخصوص شیخ الجامعہ صاحب کی طرف سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے ان کا سایہ ہمارے سروں پر عرصۂ دراز تک قائم رہے اور وہ صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے فکر و عمل اور اپنے قلم سے اسی لگن کے ساتھ خدمت کرتے رہیں۔

پروفیسر عصمت گرتلی
تلخیص: عبداللطیف اعظمی

ترکی اور روس کے تعلقات

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی اور روس کے باہمی تعلقات کی تاریخ میں تین دور بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلا دور ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتا ہے جب ترکی اور سوویٹ یونین میں مغربی ملکوں بالخصوص برطانیہ کے خلاف اتحاد پیدا ہوا۔ مصطفیٰ کمال نے، جب اناطولیہ پر برطانوی حملے کا دباؤ بہت بڑھ گیا، تو ۲۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو حکومت روس کو لکھا کہ وہ سامراج کے خلاف جنگ کرنے اور اس سلسلے میں روس سے فوجی اور سیاسی معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ روس ایک غیر کمیونسٹ حکومت سے ایک مستقل معاہدہ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا اس لیے اس نے ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال کی حکومت سے سفارتی سطح پر تعلقات قائم کر لئے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو ماسکو میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس میں سرحدی جھگڑے طے کئے گئے اور جس کے مطابق کارس اور اردہان کے صوبے ترکی کے پاس رہے اور باطوم روس کے پاس۔

سفارتی تعلقات اور سرحدی معاہدہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس نے ترکی کو ہتھیار اور مختلف قسم کے فوجی سامان بھیجے اور ۱۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کو میکائیل فرنزی جو اس وقت یوکرین میں روس کے کمانڈر انچیف تھے اور بعد میں ٹراٹسکی کی جگہ جنگ کے کیسار مقرر ہوئے، انقرہ تشریف لائے،

فاضل مضمون نگار ڈاکٹر عصمت گرتلی استنبول یونیورسٹی (ترکی) کے ڈیپارٹمنٹ آف پبلک لا اینڈ گورنمنٹ میں پروفیسر ہیں۔

جہاں ان کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ فرنزی کے واپس جانے کے بعد فوراً ہی نیا روسی سفیر ایرالوف ترکی آیا اور اس نے مصطفیٰ کمال کے ساتھ محاذ جنگ کا معائنہ اور فوج سے خطاب کیا۔ ۱۹۲۲ء کے موسم گرما میں مصطفیٰ کمال نے مسلسل آگے بڑھنا شروع کیا جس پر ماسکو سے مبارکباد کا تار موصول ہوا۔

ترکی کی جنگ آزادی ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ختم ہوئی، جب مدانیا میں صلحنامے پر دستخط ہوئے۔ اتحادیوں کو توقع تھی کہ فاتح ترکی صلحنامۂ سیورے کو مسترد کر دے گا، جس کے مطابق برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان، یگوسلاویہ، رومانیہ، بلغاریہ، سوویٹ روس، سوویٹ یوکرین، سوویٹ جارجیا اور ترکی نے لوزان میں ایک کانفرنس بلانے پر اتفاق کیا تھا۔ ماسکو نے بہت سخت احتجاج کیا کہ اسے کانفرنس میں اپنے اہم مفاد پر گفتگو کرنے کے لیے پورا موقع نہیں دیا گیا، مگر اس کے باوجود بحث و گفتگو میں اس کو ایسی باتیں کہنے کا موقع نہیں مل سکا، جن کا درۂ دانیال، آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ کے مستقبل پر اثر پڑ سکے۔

بالشویک انقلاب سے پہلے قسطنطنیہ (استنبول) اور ترکی آبنایوں کی وجہ سے زار حکومت سے صدیوں سے عداوت چلی آ رہی تھی اور روس اور ترکی کے درمیان تیرہ جنگیں ہو چکی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں زار حکومت نے فرانس اور انگلستان سے خفیہ معاہدہ کے ذریعہ یہ طے کر لیا تھا کہ قسطنطنیہ اور ترکی آبنائیں اسے دے دی جائیں گی۔ انقلاب کے بعد جب عارضی حکومت قائم ہوئی تو نئے وزیر خارجہ ملیوکوف نے اعلان کر دیا کہ فرانس اور انگلستان کے خفیہ معاہدہ کے ذریعہ قسطنطنیہ اور ترکی آبناؤں پر روس کو جو حقوق حاصل ہیں، وہ علیٰ حالہ باقی رہیں گے۔ کرینسکی کے زوال کے بعد بالشویکوں کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے تمام خفیہ معاہدوں اور فیصلوں کو ختم کر دیا اور ۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو لینن اور اسٹالن کے دستخطوں سے ایک فرمان جاری کیا گیا کہ "قسطنطنیہ مسلمانوں کے قبضے میں رہے گا۔"

انقلاب روس کے بعد درۂ دانیال کے بارے میں روس کی پالیسی میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ نکولیس دوم کی خواہش تھی کہ اس کے جنگی جہاز بغیر کسی روک ٹوک کے درۂ دانیال سے گذرا

کریں، زار حکومت کی توسیع پسندی کی وجہ سے برطانیہ اور دوسرے ممالک بھی چاہتے تھے کہ ترکی آبنائیں روس کے لیے بند کر دی جائیں۔ اب انقلاب کے بعد روس چاہتا تھا کہ آبنائیں سب کے لیے کھلی رہیں۔ لوزان کانفرنس کے موقع پر لارڈ کرزن نے تسلیم کیا کہ اب یورپ اور روس کی پالیسیاں بالکل برعکس ہو گئی ہیں۔ لوزان کانفرنس (منعقدہ ۲۳-۱۹۲۲ء) کے موقع پر چچرن اور کرزن میں جو جھڑپیں ہوئیں وہ تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس کانفرنس میں روسی ترکوں سے زیادہ ترک تھے اور یہ واقعہ ہے کہ چچرن نے آبنائیوں پر ترکی کی حکمرانی کی حمایت کی۔

کاکیشیا، کریمیا اور یوکرین کی حفاظت اور مدافعت اسی وقت ممکن ہے جب آبنائیوں کی آمدورفت پر پابندی لگا دی جائے۔ چنانچہ بالشویک وفد کے سربراہ چچرن نے ۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو لوزان کانفرنس کے علاقائی اور فوجی کمیشن کو بتلایا کہ روس کا خیال ہے کہ درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس ترکی کے علاوہ تمام ملکوں کے جنگی جہازوں کے لیے مستقل طور پر، چاہے امن کا زمانہ ہو یا جنگ کا بند کر دی جائے۔

صلحنامہ پر ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو لوزان میں تمام اتحادی ممالک اور ترکی نے دستخط کیے۔ سوویٹ نمائندے جارڈنسکی (Jordansky) نے جمہوریۂ روس کی طرف سے ۱۴ر اگست ۱۹۲۳ء کو روم میں دستخط کیے۔ ترکی نے اس صلحنامے پر دب کر دستخط کیے تھے، مگر مصطفیٰ کمال کے سامنے جو مقصد تھا وہ کبھی اوجھل نہیں ہوا، وہ ترکی کو ایک مغربی یا ایک یورپین ریاست بنانا چاہتے تھے ان کے سامنے فرانس اور برطانیہ نمونہ تھے نہ کہ روس۔ لیکن ترکی کی سیاست خارجہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، روس اور ترکی موصل کے سوال پر کچھ اور قریب آ گئے تھے، لوزان کانفرنس میں عصمت انونو اس کے لئے بہت سخت اور بہت دیر تک لڑتے رہے، مگر کرزن کا اصرار تھا کہ موصل عراق کے ماتحت رہے، چنانچہ صلحنامہ لوزان میں موصل کی تقدیر کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا اور یہ معاملہ ترکی اور برطانیہ کی باہمی گفتگو پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ نو مہینے کی مقررہ مدت میں یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکا، اس لیے اسے انجمن اقوام کی کونسل کے حوالہ کر دیا گیا اور اس نے ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو یہ نزاعی علاقہ

عراق کو دیدیا۔ اس کے دوسرے ہی دن ترکی اور سوویٹ روس میں غیر جانبداری اور دوستی کا معاہدہ ہو گیا، جس کی بعد میں، ۱۹۲۹ء میں پھر ۱۹۳۱ء، میں تجدید کی گئی اور ۱۹۳۵ء میں اس کی مدت میں دس سال کی توسیع کر دی گئی۔ ۱۸ر جولائی ۱۹۳۲ء کو ترکی انجمن اقوام کا ممبر بنایا گیا۔ اس وقت مصطفیٰ کمال کا نعرہ تھا "ملک میں بھی امن اور غیر ممالک میں بھی امن"۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترکی کا کسی ملک سے تصادم نہ ہو، وہ ہر قسم کی کشمکش سے محفوظ رہے۔ جمہوریت کی دسویں سالگرہ کے موقع پر، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو سرکاری اخبار "حاکیت ملیہ" نے لکھا کہ روسی سوویٹ جمہوریہ سے ترکی کی دوستی لینن اور مصطفیٰ کمال کے باہمی تعلق سے پیدا ہوئی تھی اور اس کی جڑیں بہت مضبوط ہو گئی ہیں۔

ترکی میں سوویٹ روس کی دوستی کی بڑی تعریف کی گئی جب مسولینی نے اناطولیہ پر اٹلی کا دعویٰ کیا، اس کے علاوہ روس نے ترکی کو فنی امداد دی اور بغیر سود کے قرضے دئے۔ ترکی نے اس نوٹ میں اٹلی کے حملے کے خطرے کا ذکر کیا تھا، جو ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کو بھیجا گیا تھا اور جس میں ۱۹۲۳ء کے اسٹریٹس (آبنائے) کنونشن پر نظر ثانی کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس نوٹ کے جواب میں معاہدۂ لوزان پر دستخط کرنے والے ملکوں نے مونٹرو میں ایک کانفرنس طلب کی، جس نے ۲۰ر جولائی ۱۹۳۶ء کے کنونشن کے مطابق آبنایوں پر ترکی کا حق تسلیم کر لیا۔ سوویت یونین نے معاہدۂ لوزان کی تصدیق نہیں کی، مگر مونٹرو کنونشن کے فیصلے پر سوویٹ یونین نے باقاعدہ دستخط کئے اور آبنایوں پر ترکی کے جملہ حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے کنونشن کی کارروائی کی تصدیق کی۔

(۲)

اس کے بعد ترکی اور روس کے تعلقات رفتہ رفتہ خراب ہونے لگے۔ ۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں ترکی میں بڑی بے چینی تھی۔ جرمنی اور اٹلی نے چیکوسلوواکیہ اور البانیہ پر حملہ کر دیا تھا۔ ترکی، برطانیہ اور فرانس نے ان کی حفاظت کے لیے مشترکہ اعلان پر سوچ بچار شروع کیا۔

۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کو برطانیہ کے ساتھ اور ۲۳ جون ۱۹۳۹ء کو فرانس کے ساتھ یہ مشترکہ اعلان شائع کر دیا گیا۔ اس درمیان میں برطانوی اور فرانسیسی وفد ماسکو گئے اور سوویٹ یونین سے گفت و شنید شروع کر دی۔ ترکی کو اس گفتگو کی کامیابی کا بالکل یقین تھا۔ ترکی، برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ اعلان کا جرمنی اور اٹلی پر بہت خراب ردعمل ہوا، جرمن ریڈیو اور اخبارات نے ترکی کو سخت برا بھلا کہا اور دھمکیاں دیں اور اس کے بعد برطانیہ، فرانس اور روس میں باہمی گفتگو شروع ہو گئی اور ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو نا جنگ معاہدہ کا اعلان سن کر دنیا دنگ رہ گئی۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکی، برطانیہ اور فرانس میں باہمی اتحاد کے معاہدہ پر گفتگو شروع ہوئی اور بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی، اس کے مطابق طے یہ پایا تھا کہ برطانیہ اور فرانس ترکی کو فوجی سامان دیں گے اور ترکی کو روس کے خلاف جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی درمیان میں سوویٹ یونین نے ترکی کے وزیر خارجہ شکری سراج اوغلو کو معاہدۂ دوستی کی تکمیل کے لیے ماسکو آنے کی دعوت ملی۔ سراج اوغلو نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ جو کچھ طے ہوا تھا، اس کی سوویٹ یونین کو اطلاع کی اور معاہدہ پر دستخط کرنے سے قبل دونوں ملکوں کو بتلایا کہ روس سے بات چیت کرنے کے لیے وہ ماسکو جا رہے ہیں، نیز انھوں نے یہ بھی کہا کہ اپنے ملک کے مفاد میں دونوں فریقوں سے تعلقات کے بارے میں عجلت میں کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتے۔

سراج اوغلو ۲۵ ستمبر کو ماسکو پہنچے اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو واپس آگئے۔ ابتدائی گفتگو بہت کامیاب رہی، لیکن معاہدہ پر دستخط سے قبل برطانیہ کے ساتھ جو سمجھوتہ ہوا تھا، روس نے اس میں بعض ترمیموں کا مطالبہ کیا۔ ترکی نے برطانیہ اور فرانس سے ان ترمیموں پر رضامندی کی درخواست کی، جو طویل بحث و گفتگو کے بعد منظور کر لی گئیں۔ ترکی کو اطمینان ہو گیا کہ سوویٹ یونین سے معاہدہ کی تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں، مگر سوویٹ یونین نے ایک نیا مطالبہ کر دیا اور معلوم ہوا کہ ابھی بعض مسئلوں پر مزید گفتگو باقی ہے۔ یہ نئی صورت حال ترکی کے وزیر خارجہ سراج اوغلو کے لیے

بالکل غیر متوقع تھی، اس لیے وہ ماسکو سے واپس آگئے اور ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو انقرہ میں ترکی، برطانیہ اور فرانس کے درمیان معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ سرکاری تقریروں سے معلوم ہوا کہ اس معاہدے سے سوویٹ یونین ناخوش ہو گیا ہے۔

جرمنی نے فرانس پر قبضے کے زمانے میں ایسی فرانسیسی دستاویزیں شائع کیں، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ترکی نے روس کے خلاف فرانس اور برطانیہ کی مدد کی ہے، اس سے اسکا مقصد یہ تھا کہ ترکی اور روس میں لڑائی چھڑ جائے گی اور رومانیہ کی طرح ترکی مجبور ہو کر جرمنی سے مل جائے گا اور روس کا متوقع حملہ ٹل جائے گا۔ ترکی نے اس صورت حال کا سکون اور حکمت عملی سے مقابلہ کیا اور روس کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ دستاویزات فرضی ہیں۔ نیز جرمنی کی توقعات کے بالکل خلاف ترکی نازی حکومت کی طرف ذرا بھی نہیں جھکا۔

۱۹۴۱ء کے موسم بہار میں جرمنی نے بلقان کے علاقے پر حملہ کیا اور یونان اور یوگوسلادیہ پر اس کا قبضہ ہو گیا، اس طرح ترکی، خشکی اور سمندر دونوں طرف سے جرمنی اور اٹلی کی فوجوں سے گھر گیا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں ترکی نے اپنی تمام فوجوں کو، جن میں پانچ لاکھ فوجی شامل تھے، تھریس اور ایجین کے سواحل پر متعین کر دیا۔ رومانیہ پر قبضہ کے بعد، سوویٹ جرمن تعلقات میں، جو کچھ عرصے سے پُر سکون تھے، ۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں نئی سرگرمیاں پیدا ہوئیں، فروری اور مارچ ۱۹۴۱ء میں سوویٹ اور بلغاریہ کے تعلقات میں بھی زندگی پیدا ہو گئی، کچھ سوویٹ یا تبدیل سرکاری حیثیت میں بلغاریہ گئے تو وہاں ترکی کے خلاف مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئیں، مختصر یہ کہ ترکی پر حملہ کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔

اس نازک موقع پر جرمنی نے ظاہر کیا کہ وہ ترکی پر حملہ نہیں کرے گا اور اس کے بعد ناجنگ معاہدہ کی پیش کش کی۔ ترکی نے اس شرط پر اس پیش کش کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ برطانیہ سے جو معاہدہ ہوا ہے، اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جون میں جرمنی سے ناجنگ معاہدہ کی گفتگو شروع ہوئی اور جولائی ۱۹۴۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

سوویٹ یونین پر جرمنی کے حملے اور افریقہ میں محوری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے بعد ترکی نے جرمنی کو راستہ دینے سے انکار کر دیا، مونٹرو کنونشن کے سرپرست کی حیثیت سے اس نے ایک طرف اطالوی بحریہ کو بحیرۂ روم سے بحر اسود جانے کی اجازت نہیں دی اور دوسری طرف اچانک حملے کے خطرے کی بنا پر اپنی سرحدوں پر تمام فوجیں متعین کر دیں۔

دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی برسوں میں سوویٹ یونین اور ترکی کے باہمی تعلقات عام طور پر معمول پر رہے، سوویٹ یونین چاہتا تھا کہ ترکی غیر جانبدار رہے اور اس کی اس پالیسی اور عمل کی تعریف کی۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۱ء کو سوویٹ یونین نے ترکی کو ایک نوٹ دیا، جس پر برطانیہ کے بھی دستخط تھے، اس میں مونٹرو کنونشن سے مکمل اتفاق اور وفاداری کا یقین دلایا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں سوویٹ حکومت نے اپنے سفیر متعینہ انقرہ کے ذریعہ حکومت ترکی کو ایک پیغام دیا، جس میں ترکی کے طرز عمل پر اطمینان ظاہر کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۳ء کے شروع میں ونسٹن چرچل کاسابلنکا میں صدر روزولٹ سے مل کر اور ان سے پوری مفاہمت کے بعد ادنہ پہنچے تو انھوں نے بھی ترکی کے موقف کی تعریف کی۔ اس وقت جرمنی اور اٹلی کا پورے یورپ پر کنٹرول تھا، مگر شرق وسطی میں ابھی گھسنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ۱۹۴۳ء کے اواخر میں تہران میں طے پایا کہ ترکی کو بھی جنگ میں شریک ہونا چاہئے اور اس فیصلہ کی اسے اطلاع کر دی گئی اور عصمت انونو کو روزولٹ اور برطانوی وزیر اعظم سے قاہرہ میں گفتگو کے لیے دعوت دی گئی۔ ترکی نے ایسے سامان جنگ کا مطالبہ کیا جن سے وہ جرمنی اور بلغاریہ کے متوقع حملے کا جواب دے سکے، برطانوی فوجی مشن انقرہ گیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ترکی کو ضروری سامان دینے سے قاصر ہیں۔

چرچل نے ۲۴ مئی ۱۹۴۴ء کو ایک تقریر میں ترکی پر الزام لگایا کہ وہ خطرے اور احتیاط کے معاملہ میں مبالغے سے کام لے رہا ہے اور بہت زیادہ سامان جنگ کا مطالبہ کر رہا ہے، مگر جیوفرے لیوس کے بقول ترکی کی احتیاط حق بجانب تھی۔ اسے واقعی صورت حال کا مقابلہ

کرنے کے لیے جدید قسم کے ہتھیاروں کی شدید ضرورت تھی۔

۱۴ جون ۱۹۴۴ء کو اعلان کیا گیا کہ ترکی نے ایک جرمن بحری امدادی فوج کو درۂ دانیال سے گذرنے کی اجازت نہیں دی۔ دوسرے دن وزیر خارجہ نعمان مینیمنجی اوغلو (Numan Menemencioglu) کو جو ترکی زمانۂ جنگ کی خارجہ پالیسی کے ذمہ دار تھے، سبکدوش کر دیا گیا اور ان کی جگہ وزیر اعلیٰ سکرو سراج اوغلو اور بعد میں حسن ساکا کو وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ اگست ۱۹۴۴ء میں جرمنی سے ترکی کے سفارتی اور معاشی تعلقات منقطع ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں جب بلغاریہ نے سرخ فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو استنبول اور بحرِ اسود کے شہروں میں بڑے اہتمام کے ساتھ بلیک آؤٹ کے قاعدوں پر عمل ہونے لگا۔ اُس زمانے میں استنبول میں یہ مذاق بہت عام تھا کہ روس سفیر نے ترکی کے وزیر خارجہ سے کہا کہ "آپ خواہ مخواہ کے لیے بلیک آؤٹ سے عوام کی زحمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہم اگر حملہ کریں گے تو دن کے وقت کریں گے۔"

۲۳ فروری ۱۹۴۵ء کو ترکی نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، مگر مارچ تک اس پر عمل ملتوی رکھا گیا۔ یہ اعلان اس فیصلے کی وجہ سے کرنا پڑا جس میں طے پایا تھا کہ سین فرانسسکو میں اقوام متحدہ کی ہونے والی کانفرنس میں صرف انہیں ملکوں کو بلایا جائے گا، جو محوری طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کریں گی۔

ترکی اور روس کے معاہدۂ دوستی کی، جو ۱۹۲۵ء میں کیا گیا تھا، ۱۹۳۵ء میں مزید دس سال کے لیے تجدید کی گئی تھی، مگر ۱۹ مارچ ۱۹۴۵ء کو سوویٹ حکومت نے نوٹس دیا کہ دوستی اور ناجنگ معاہدہ کی مدت میں، جو اگلے نومبر میں ختم ہونے والی ہے، مزید توسیع نہیں کی جائے گی۔ روس نے تین بڑوں کی کانفرنس کے ایجنڈے میں جو یالٹا کے مقام پر فروری ۱۹۴۵ء میں ہونے والی تھی، ترکی آبنایوں کا مسئلہ شامل کرا دیا اور اسٹالن نے اعلان کیا کہ مونٹرو کے کونشن میں روس کے ساتھ تعصب سے کام لیا گیا ہے، انہوں نے تجویز کیا کہ اس میں ایسی ترمیم

کرنے کی ضرورت ہے کہ روس کے فوجی جہاز ہر زمانے میں ــــ چاہے جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا ــــ ترکی آبنایوں سے آزادی کے ساتھ گذر سکیں۔ جولائی کے شروع میں ترکی وزیر اعظم شکرو سراج اوغلو نے امریکا کے سفیر ایڈون، سی، ولسن سے کہا کہ: "ہم روس سے پوری سرگرمی اور جوش کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آبنایوں کے کنونشن کے فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے گفتگو کرنے پر ہم پوری طرح تیار ہیں۔ آبنایوں سے گذرنے کے معاملہ میں ہمارے مقابلے میں آبنایوں کے قرب وجوار کے ممالک کو زیادہ دلچسپی ہے، ہم تو صرف اپنی سرزمین کا تحفظ چاہتے ہیں، ہم سوویٹ غلبہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔" جولائی ۱۹۴۵ء میں پوٹس ڈم کانفرنس میں سوویٹ نمایندے نے اس مسئلے کو دوبارہ اٹھایا تو چرچل نے جواب دیا کہ ترکی نہ تو اس پر تیار ہوگا کہ آبنایوں کے کنارے سوویٹ روس اپنے اڈے قائم کرے اور نہ اس پر کہ آبنایوں پر صرف روس کا کنٹرول رہے۔ چرچل نے جہاں ترکی کی حمایت کی وہاں اس سے بھی اتفاق کیا کہ مونٹرو کنونشن کی نظر ثانی کے لیے تین بڑے ممالک میں سے ہر ایک ترکی سے براہ راست بات کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸ راگست ۱۹۴۶ء کو روس نے مطالبہ کیا کہ مونٹرو کنونشن پر ایک ایسی کانفرنس میں نظر ثانی کی جائے جس میں ترکی اور صرف بحر اسود کے ممالک اور روس شریک ہوں، نیز سوویٹ یونین کو آبنایوں کی مدافعت کی ذمہ داری میں شریک کیا جائے۔ مگر ترکی نے سوویٹ روس کے مطالبے کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔

مارچ ۱۹۴۷ء کو ٹرومین ڈاکٹرن (TRUMAN DOCTRINE) کے تحت ترکی اور یونان کو امریکی امداد جاری کی گئی، اس امداد کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں ملک سرخ خطرے کا مقابلہ کر سکیں۔ ۱۹۴۹ء میں جرمنی کی وزارت خارجہ کے خفیہ معاہدے شائع کئے گئے، جن سے معلوم ہوا کہ جرمنی اور روس کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ سوویٹ یونین کو ترکی آبنایوں پر پورا کنٹرول حاصل ہوگا۔

(۳)

کمال کارپات نے لکھا ہے کہ ترکی کی کمیونسٹ تحریک اور اس کے بارے میں سرکاری طرز عمل کو [illegible]

ںانات ترکی اور سوویٹ روس کے تعلقات میں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے شروع میں مصطفیٰ کمال
اجازت سے محمود جلال بابا یار اور تیرہ دوسرے فوجیوں نے Yesil Orda (سبز فوج) قائم
۔ اس فوج کے رہنما جرکس اتہم سوشلسٹ نظریات سے متاثر تھے اور انھوں نے سوویٹ روس
طرز پر ترکی میں مزدوروں اور فوجیوں کی کونسلوں کے قیام میں مدد دی۔ جب جرکس اتہم نے فوجی
د مختاری کی تحریک شروع کی تو انکرا کے ارباب اختیار نے اس کی مخالفت کی اور مصطفیٰ کمال
ے عقیدت مندوں نے اسے الگ کر دیا، ۱۹۲۰ء ہی میں اشتراک خلق پارٹی قائم ہوئی تو اسے عام
ور پر سبز فوج ہی کی ایک شاخ سمجھا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت نے اس پارٹی کو ختم کر دیا۔ ۱۹۲۰ء ہی
ں عارف عروج اور صالح ذکی نے غیر قانونی طور پر ایک کمیونسٹ پارٹی قائم کی، جو سلطان اور
مصطفیٰ کمال کے خلاف تھی، اس کے متعدد اخبارات بھی تھے، مثلاً ایمک (مزدور) اور اینی دنیا
ئی دنیا)، ۱۹۲۲ء میں جب ترکی میں کمیونسٹ سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کی گئیں تو یہ ختم ہو گئی مگر
زدوروں اور فوجیوں کی کونسلوں کی شدت میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے خود مصطفیٰ کمال نے
پنے قریبی دوستوں کی ایک کمیونسٹ پارٹی قائم کرنے کے لیے خفیہ ہدایت کی۔ اس پارٹی کے نقطۂ نظر
کے مطابق کمیونسٹ ترکی قوم کی فلاح و بہبود کے منصوبوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھے اور قومیت ان
ا اعلیٰ مقصد تھی۔ جلد ہی کونسلوں نے اس سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا اور اس پر الزام لگایا
ہ اس کی پشت پر ترکی کے سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں جو جفاکش عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

ترکی میں صحیح معنی میں کمیونسٹ پارٹی وہ تھی جو ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو ترکی کے مزدوروں اور کسانوں کی سوشلسٹ پارٹی شفیق حسنو اور اتہم نجات کی رہنمائی میں استنبول میں قائم ہوئی تھی۔ مارکس اور لینن کے سماجی اور سیاسی نظریات اس پارٹی کا مطمع نظر تھے۔

ترکی کے باہر کمیونسٹ تحریک کے رہنما مصطفیٰ صوفی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے اپنا صدر دفتر باکو میں منتقل کیا، جہاں سے انھوں نے نئی دنیا شائع کیا اور ۱۹۲۰ء میں وہ مشرقی عوامی کانگریس کے پریزیڈیم کے ممبر تھے۔ پارٹی کی سرگرمیوں کو منظم کرنے کی غرض سے مصطفیٰ صوفی اور

ان کے سولہ پیروکار ترکی میں داخل ہوئے تو طرابزون میں عوام نے انھیں مار ڈالا۔ مزدور کونسلوں سے تعلقات میں توسیع ہوئی تو ترکی حکومت نے گرفتار کمیونسٹوں کی رہائی اور مصطفیٰ صوفی کے قاتلوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۲۵ء میں جب لا اینڈ آرڈر کے قیام کے لیے قانون نافذ ہوا تو شفیق حسنو کی پارٹی انڈر گراؤنڈ چلی گئی، مگر پمفلٹ اور ہینڈبل اور خفیہ تنظیموں کے ذریعہ اس کی سرگرمیاں جاری رہیں؛ ساتھ ہی ساتھ گرفتاریوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۳۲ء میں ناظم حکمت کو ان کی انقلابی نظموں کی بنا پر گرفتار کیا گیا، ۱۹۳۸ء میں انھیں دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں انھیں رہا کیا گیا اور ۱۹۵۱ء میں انھوں نے بھاگ کر سوویٹ یونین میں پناہ لی، جہاں ۱۹۶۰ء کے عشرہ میں وفات پائی۔

سیاسی آزادی، خصوصاً ۱۹۴۶ء میں ایسوسی ایشن لا، میں ترمیم کے بعد ۱۹ جون ۱۹۴۶ء کو شفیق حسنو نے ترکی مزدوروں اور کسانوں کی سوشلسٹ پارٹی کو دوبارہ قائم کیا، ۱۴ مئی ۱۹۴۶ء کو ایست عادل مستجاب لی اوغلو نے ترکی سوشلسٹ پارٹی قائم کی، جو نظریے کے اعتبار سے مارکسی تھی، لیکن عملاً روایتی سوشلسٹ پارٹیوں سے ملتی جلتی تھی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۴۶ء کو مارشل لا کے تحت شفیق حسنو اور ایست عادل کی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی گئی، اور ان کے رہنماؤں کا مقدمہ ایک طویل عرصے کے بعد ۱۹۴۸ء میں ختم ہوا، شفیق حسنو اور پچپن دوسرے رہنماؤں کو قید کی سزا ملی، ایست عادل بری کر دیے گئے اور انھیں اپنی پارٹی کی تنظیم کی اجازت مل گئی، ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں اس پارٹی کو استنبول میں ۷۵،۰۰۰ ووٹوں میں سے زیادہ سے زیادہ ۲۲۰ ووٹ ملے، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۸ء کی درمیانی مدت میں دوسرے کمیونسٹ گرفتار ہوئے اور سزا ملی۔

(۴)

جنگ کے بعد سوویٹ روس کے مطالبوں کی مزاحمت میں ترکی کو بڑا سہارا ملا جب امریکا نے اپنی بحری طاقت کا مشرقی بحر روم میں مظاہرہ کیا۔ ترکی مغربی اتحاد سے اور قریب آگیا، روس

نے ترکی کے ردِ عمل کا غلط اندازہ کیا اور مئی ۱۹۵۳ء میں اسٹالن کی وفات کے فوراً بعد سوویٹ حکومت نے سرکاری طور پر ۱۹۴۵ء کے مطالبہ کو واپس لے لیا۔

یکم اگست ۱۹۵۰ء کو ترکی نے نیٹو (NATO) میں شرکت کی درخواست کی، ستمبر میں نیٹو کی کونسل کی میٹنگ ہوئی تو ناروے اور ڈنمارک نے ترکی اور یونان کی شرکت پر شدید اعتراض کیا، برطانوی اور فرانسیسی حکومتیں، بالخصوص ثانی الذکر، ترکی کی شرکت کو اس لیے پسند نہیں کرتا تھیں کہ ایک ایسے ملک کی ضمانت کرنا جو روس کی دہلیز سے ملا ہو، مصلحت کے خلاف تھا اور اس کے لیے جواز یہ تلاش کیا گیا کہ ترکی شمالی اٹلانٹک ممالک میں کسی لحاظ سے شامل نہیں ہے۔ ۱۸ فروری ۱۹۵۲ء کو ترکی کو بالآخر نیٹو کا ممبر بنا لیا گیا اور اسے مغربی طاقتوں سے اس کی ضمانت مل گئی کہ اگر کسی نے اس پر حملہ کیا تو اس کی مدافعت کی جائے گی، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب ترکی نے کوریا کی جنگ میں اپنی بیس ہزار کی فوج بھیج کر اپنی مغرب دوستی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

ازمیر کی ترکی بندرگاہ کو نیٹو کی جنوب مشرقی یورپ کمانڈ کے صدر دفتر کے لیے انتخاب کیا گیا، ۹ اگست ۱۹۵۴ء کو بلیڈ میں ترکی، یونان اور یگوسلاویہ کے درمیان فوجی معاہدہ ہوا، اسی سال ۲ اپریل کو ترکی اور پاکستان میں باہمی دوستی کا معاہدہ ہوا تھا، اس نے ترکی عراق کے معاہدۂ ۱۹۵۵ء کے لیے جو معاہدۂ بغداد کے نام سے مشہور ہوا، راہ ہموار کی۔ ان تمام معاہدوں کی پشت پر امریکا تھا، مگر جب اس میں برطانیہ، پاکستان اور ایران شامل ہو گئے، تو وہ اس میں شریک نہیں ہوا، اگرچہ بعد میں اس نے نیٹو کی مختلف کمیٹیوں کی ممبری قبول کر لی۔

اسٹالن کی وفات کے فوراً بعد، ۳۰ مئی ۱۹۵۳ء کو روس نے اپنے ۱۹۴۵ء کے مطالبے واپس لے لئے اور ترکی سے اچھے تعلقات کی خواہش کی، اس وقت سے سوویٹ یونین اور دوسرے کمیونسٹ ممالک ترکی حکومت کو اپنا طرفدار بنانے کی برابر کوشش میں ہیں۔ چنانچہ سوویٹ یونین نے ترکی کی صنعتی ترقی کے لیے فنی اور مالی امداد کی پیش کش کی، شروع میں تو ترکی نے اس طرف توجہ نہیں کی، ۱۹۶۰ء میں ترکی وزیر اعظم مندریس نے ماسکو جانے کا فیصلہ کیا، مگر ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء

کو فوج نے ان کو اقتدار سے محروم کردیا، جس کی وجہ سے شمال کے ہمسایے سے اچھے تعلقات پیدا کرنے کی ذمہ داری ان کے جانشین پر آپڑی۔

۱۹۶۴ء میں روس اور ترکی کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ پر دستخط ہوئے، جس میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۷ء میں مزید اضافے کیے گئے۔ بعض صنعتی منصوبوں کے لیے روس نے قرضے دیے اور اپنے مشیر کار بھیجے، سب سے بڑا قدم مارچ ۱۹۶۸ء میں اٹھایا گیا اور ایک معاہدہ کے مطابق ترکی کے مختلف علاقوں میں دو سو ملین ڈالر کے خرچ سے روس صنعتی کارخانے قائم کرے گا، جن سے مال کی برآمد ۱۹۷۲ء میں شروع ہو جائے گی۔ ترکی وزیر اعظم اورگپ لو (Urguplu) ۱۹۶۶ء میں ماسکو گئے اور روس کے وزیر اعظم کوسی گن ۱۹۶۶ء میں انکرا آئے۔ موجودہ ترکی وزیر اعظم ڈیمرل بھی ستمبر ۱۹۶۷ء میں ماسکو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ملاقاتوں سے سائپرس کے معاملے میں ترکی کو روس سے تقویت پہنچی ہے، لیکن ترکی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ روس میکاریوس کو جنگی سامان سے مدد کر رہا ہے، اس لیے وہ امریکا کی دوستی اور مالی امداد کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔

ترکی نے اپنا دوسرا پنج سالہ منصوبہ شروع کیا ہے، جس میں بھاری صنعتوں کی ترقی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی فولاد اور بجلی ہے۔ اس منصوبہ میں جو سرمایہ لگایا جائے گا اس کا ۴۳ فیصدی صنعت کاری پر صرف ہوگا۔ منصوبے کی کامیابی کے لیے ترکی حکومت نے حکومت روس سے متعدد صنعتی منصوبوں کے قیام میں مدد کے لیے درخواست کی ہے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۷ء کو دونوں ملکوں کے درمیان معاہدہ ہوا ہے کہ سوویٹ روس سات بڑے کارخانوں کی تعمیر و ترقی میں شرکت کرے گا: فولاد کا کارخانہ، تیل کی صفائی کا کارخانہ، المونیم کا کارخانہ اور چار دوسرے منصوبے۔ مشینوں کی خریداری اور ماہرین کی خدمات کے لیے سوویٹ یونین نے آسان شرائط پر قرضے منظور کیے جو روئی، اون، تمباکو، پھل اور نئی قومی صنعت کی پیداوار کے ذریعہ ادا کیا جائے گا، اس طرح ترکی نے نہ صرف یہ کہ اپنے بیرونی زر مبادلہ کو بچا لیا، جس کی اس کے

یہاں کافی کمی تھی، بلکہ اپنے مال کی کھپت کے لیے وسیع بازار پیدا کرلیا۔

ان نئے منصوبوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ الومنیم اور فولاد کے کارخانوں کے قیام کے بعد ترکی درآمدی ملک کے بجائے الومنیم اور فولاد کے معاملے میں برآمدی ملک بن جائے گا اور ہر سال کوئی پانچ لاکھ ٹن لوہا اور فولاد برآمد کرسکے گا۔ اسی طرح جب تیل صاف کرنے کا کارخانہ کام کرنے لگے گا تو ترکی پٹرولیم سے متعلق ضمنی اشیاء کے معاملے میں بیرونی ممالک کا محتاج نہیں رہے گا اور بیرونی زرمبادلہ کو خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، ترکی اور روس کے باہمی تعاون سے بیرونی تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ ابھی حال میں سوویٹ روس اور ترکی کے درمیان براہ راست ریل اور ہوائی سفر اور ٹیلیفونی رسل و رسائل قائم ہوئے ہیں اور سرحدی دریائے اخوریان پر ڈیم کی مشترک تعمیر کا سمجھوتہ ہوا۔

دو ملکوں کے درمیان، جہاں دو مختلف سماجی نظام قائم ہوں، پرامن بقائے باہم کے اصول پر ۱۹۲۰ء کے عشرہ میں لینن اور مصطفیٰ کمال عمل کرچکے تھے۔ ترکی اور سوویٹ یونین کے ہمسائگی کے اچھے تعلقات کی بنیاد اعتماد، آزادی اور علاقائی سالمیت کے باہمی احترام اور گھریلو معاملات میں عدم مداخلت کے اصول پر تھی۔ یہ سوویٹ روس تھا، جس نے اس پالیسی کی خلاف ورزی کی۔ اگر سوویٹ یونین پھر سے اس پر عمل کرنا چاہتا ہے تو مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق ترکی اس کے لیے بالکل تیار ہے۔

عتیق صدیقی

واگست

(عتیق صدیقی صاحب ایک خاص رنگ میں اپنی زندگی کے تجربات قلمبند کر رہے ہیں، اس کا ایک حصہ انھوں نے ماہنامہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت کیا ہے، ہم اس کے وہ ٹکڑے جو عام دلچسپی کے ہیں شائع کر رہے ہیں ———— 'مدیر')

دن کے دو بجے تھے۔ میں دفتر میں تنہا بیٹھا سہ پہر کو نشر کیا جانے والا پروگرام مرتب کر رہا تھا کہ آفت ناگہانی کی طرح مجید کمرے میں داخل ہوئے۔ ۲۸-۱۹۲۷ء میں بہ سلسلہ تعلیم یہ لکھنؤ میں تھے، اور وہیں پہلی بار ہم ملے تھے۔ ملک کے اور نوجوانوں کی طرح انھیں بھی سیاست سے خاص دلچسپی تھی، لیکن بیشتر طالب علموں کی طرح عملی سیاست سے ان کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ ۱۹۲۹ء کے اوائل میں اینگلو ایرانین آیل کمپنی میں انھیں ملازمت مل گئی اور وہ ایران چلے گئے۔ میرے تہران پہنچنے کے تیسرے یا چوتھے دن کتابوں کی ایک دوکان میں ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں اس وقت تک ایران میں 'غریبِ شہر' تھا، اور اپنے دفتری ماحول سے بھی مانوس نہ ہوا تھا، اس لئے یہ اتفاقی ملاقات خدا داد نعمت معلوم ہوئی، اور لکھنؤ کی شناسائی نے جلد ہی دوستی کا رنگ اختیار کر لیا۔ مجید کا دفتر تو آبادان میں تھا، لیکن دسویں پندرہویں انھیں تہران بھی آنا پڑتا۔ اس طرح مہینے میں آٹھ دس دن وہ تہران ہی میں رہتے، اور ان دنوں میں، دفتری اوقات کے علاوہ جتنی تر

وقت ہم ایک ساتھ گزارتے۔

"آج تم بہت برے وقت پر آئے ہو مجید" صاحب سلامت کے بعد میں نے کہا" آج بہت کام کرنا ہے مجھے"

"کیے جاؤ کام" مجید نے لاپروائی سے کہا "تمھیں بیل کی طرح کام میں جُتتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی" میں الماری سے فرمائشی گانوں کے وہ ریکارڈ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا رہا، جو آج کے پروگرام میں سنانے تھے، اور مجید ٹہل ٹہل کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی کسی بات کا میں جواب بھی دے دیتا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک بڑے سے کلینڈر کے سامنے وہ کھڑا ہوگیا۔

"آج نویں اگست ہے" تاریخ کے خانے میں انگلی رکھتے ہوئے مجید نے کہا "۹ اگست ۴۲ کی تیسری سال گرہ!"

"ہاں آج ۹ اگست ہے" چند لمحوں تک مجید کی بات پر غور کرنے کے بعد میں نے جواب دیا "تم ٹھیک کہتے ہو آج ۹ اگست ۱۹۴۲ کی تیسری سال گرہ ہے۔"

"میں ہمیشہ ٹھیک بات کہتا ہوں" مجید نے سینہ تان کر کہا "اس یادگار دن کو تو منانا چاہئے"

"معلوم ہوتا ہے کہ آج تمھاری قومیت کی رگ یکایک بیدار ہوگئی ہے۔"

"میری قومیت کی رگ خوابیدہ کبھی نہیں رہتی" اس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا "میری تجویز کہ آج شام کو تم میرے ہوٹل آجاؤ، وہیں اطمینان سے ۹ اگست منائیں گے۔ اچھا میں جاتا ہوں، ابھی کچھ ضروری کام ہیں"۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔

"آؤ" مجھے دیکھتے ہی مجید نے کہا۔ آج خلاف معمول وہ ہندستانی لباس میں، ہندستانی وضع فرش پر ٹانگیں پھیلائے تکیہ کے سہارے نیم دراز تھا۔

"آج تو تم بالکل نئے آدمی معلوم ہورہے ہو" میں نے بھی فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی بیٹھو نہیں" تحکمانہ لہجے میں مجید نے کہا "آج تم بھی اس لعنت کو اتار پھینکو، غسل خانے میں جاؤ وہاں کرتا پاجامہ تمہارے لیے بھی رکھا ہے، آج تم بھی نئے آدمی بن جاؤ "

مجھے یہ ساری باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں، لیکن ان میں تصنع یا بناوٹ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

"آج تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟" میں نے کچھ حیرانی سے سوال کیا۔

"۹ اگست ہو گیا ہے" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، پھر شاعرانہ انداز میں کہنا شروع کیا "کتنی رومانیت، کتنی جاذبیت کتنی کشش ہے اس تاریخ میں۔ حضرت عیسٰی کی وفات کے بعد دنیا کی تاریخ میں یہی دن ۱۹۴۱ بار آ چکا تھا، لیکن ۱۹۴۲ کے عیسوی سال کی نویں اگست کا دن ہماری ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔ ہمارے ملک نے ـــــ دنیا کے ایک غلام اور مجبور و محکوم ملک نے ـــــ دنیا کی وسیع ترین سلطنت کی مالک قوم کو للکار کر کہا 'ہندستان چھوڑ دو'، ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم آزاد ہوں گے، ہم نے عزم کیا ہے کہ اپنی غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر پھینک دیں گے۔ کتنی رومانیت، کتنی جاذبیت، کتنی کشش ہے ۹ اگست کی تاریخ میں۔"

مجید کی باتیں میں دلچسپی سے سن رہا تھا۔ یوں تو ساغر و مینا کو دیکھتے ہی وہ ہمیشہ باغ و بہار بن جاتا تھا اور اس کی گل افشانیِ گفتار قابل دید و شنید ہوتی تھی۔ لیکن آج اس پر سرخوشی و سرمستی سے زیادہ وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوہ دماوند کی بلند و بالا چوٹیوں کی اوٹ سے ابھرتے ہوئے چاند نے، جس کی ہلکی و خنک روشنی براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اس کے جام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

"۹ اگست ۱۹۴۲ء کو میں ہندستان میں نہیں تھا" گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مجید نے کہا "میرے پیروں میں تو ملازمت کی بیڑیاں پڑی تھیں، اور میں وطن سے ہزاروں میل دور تھا، لیکن میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ اسی ۹ اگست کو:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق "

"نوجوان ہی نہیں جو من چلے اور عاشق کے پتلے ہوتے ہیں، بلکہ ہندستان کے بچے اور بوڑھے بھی اس آتش نمرود میں بے خطر کود پڑے تھے۔ مجھے لوگوں نے بتلایا ہے کہ اس وقت ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اک آگ سی لگی تھی۔ بیسویں صدی کی دوسری جنگ عظیم بھی ان دنوں شباب پر تھی، اور اپنے آغاز کا تیسرا سال ختم کر کے ایک فیصلہ کن منزل میں داخل ہونے والی تھی۔ مغرب میں جرمنی اور اٹلی کی فاشست فوجیں ایک طرف افریقہ کو اور دوسری طرف مشرقی یورپ اور سویٹ روس کو تاراج کرتی ہوئی مغربی ایشیا کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مشرق میں فاشست جاپان کی فوجیں دکھنی پوربی ایشیا کو روندتی ہوئی ہندستان کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں ــــ اور ہندستان میں داخلی بغاوت کے طوفان امڈ رہے تھے۔ دکھنی پوربی ایشیا اور ہندستان کو فاشستی درندوں سے بچانے کے لیے ہندستان کی سرزمین برطانوی اور امریکی فوجیوں سے پٹی پڑی تھی۔ ان ایشیائی ملکوں کو بچانا اس لئے ضرور تھا کہ برطانیہ کی سامراجی سرحدیں رودبار انگلستان سے نہیں بلکہ ہندستان اور دکھنی پوربی ایشیا سے شروع ہوتی ہیں۔ ایشیا کے یہ حصے اگر نکل جائیں تو انگلستان کی بھی خیر نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ برطانوی فوجیں جو ہندستان ہی کی حفاظت کے لئے ہندستان میں ڈیرے ڈالے تھیں، نہتّے ہندستانیوں کے مقابلے میں صف آرا کر دی گئی تھیں۔ لیکن 'ہندستان چھوڑ دو' کے طوفان کو وہ بھی نہ روک سکیں۔ ملک کے گوشے گوشے سے 'ہندستان چھوڑ دو' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، اور ان کی صدائے بازگشت انگلستان اور امریکا کے سرکاری ایوانوں میں بھی گونج رہی تھیں۔ برطانوی سپاہی رات کو 'ہندستان چھوڑ دو' کے خواب دیکھتے تھے اور نیند میں بھی وہ اسی کی صدائیں سنتے تھے۔"

مجید بولتے بولتے یکایک خاموش ہو گیا، جیسے تھک گیا ہو یا اس کی قوت گویائی اس کے جذبات کی رو کا ساتھ دینے سے قاصر ہو۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ، آنکھوں کی سرخی، اور رگوں کا تناؤ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تکیہ کے سہارے وہ نیم دراز ہو گیا۔ میں بھی اس کے سینے کا سہارا لے کر لیٹ گیا۔ کمرے میں ایسا مکمل سکوت طاری

تھا کہ مجید کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

"یار یہ بتاؤ" کچھ دیر بعد لیٹے ہی لیٹے اس نے سوال کیا "تم تو کانگرسی تھے، تم اس آگ میں کیوں نہیں کودے؟"

اس بار مجید کی آواز میں نرمی و گھلاوٹ تھی، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا اعصابی تناؤ کچھ کم ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے اس سوال نے، جو میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا، میری دکھتی ہوئی رگ کو اس طرح دبوچا تھا، جیسے شکاری کتا کسی خرگوش کو گردن سے جالیتا ہے۔

"تمہارا سوال درست ہے" تلملا کر میں نے جواب دیا "میں آج بھی کانگرسی ہوں"

"لیکن تمہارے اس جواب میں کچھ تضاد ضرور ہے" مجید نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اس تضاد کو سمجھنے کے لیے تمہیں کانگرس کی تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی" میں نے جواب دیا "تمہیں یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ کانگرس خود مجموعۂ اضداد ہے"

"یہ تو فلسفۂ تاریخ کا بالکل نیا نظریہ تم پیش کر رہے ہو" مجید نے کچھ ناک بھوں چڑھا کر کہا "تم اپنی بزدلی کو اس نئے فلسفے سے شاید ڈھکنے کی کوشش کر رہے ہو"

"تمہارا یہ بے رحمانہ خیال صحیح نہیں ہے" میری آواز غیر ارادی طور پر کچھ تیز ہوگئی۔ "اپنی قوم پرستی کا اظہار کر کے میری قوم پرستی کی توہین کرنے کا جواز تم پیدا نہیں کر سکتے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو" مجید نے کچھ نرم لہجے میں سوال کیا "کانگرس کے مجموعہ اضداد ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"کانگرس اپنے ابتدائی دور ہی سے سیاسی پارٹی سے زیادہ سیاسی پلیٹ فارم رہی ہے" میں نے اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی۔ "۱۹۲۴ء تک اس میں صرف دو متضاد عناصر رہے۔ ایک متحدہ قومیت کا ماننے والا تھا، اور دوسرا ہندو راشٹر کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد اس میں کم از کم دو اور متضاد عناصر شامل ہو گئے ـــــــ ہندوستانی سرمایہ داری کے ایجنٹ اور کمیونسٹ، جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ ان تمام متضاد عناصر کو انگریز دشمنی کے مشترک جذبے نے کانگرس

کے دھاگے میں پرو دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے کو کانگرسی کہتا تھا، اور دوسرے کے کانگرسی ہونے کا بھی منکر نہیں تھا۔ اسی لیے کانگرس کو میں نے مجموعہ اضداد کہا ہے۔"

"اچھا تو تمھارا تعلق ان میں سے کس تضاد سے تھا؟" مجید نے طنزاً مزید سوال کیا۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے" مجید کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "قوم پرستی مجھے وراثتاً ملی ہے۔ میرے باپ کٹر نیشنلسٹ تھے۔ مرتے وقت بھی انھوں نے وصیت کی تھی کہ کھدر میں انھیں کفنایا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس کی سرگرمیوں میں جب میں نے عملی حصہ لینا شروع کیا تو کانگرس کے کیونسٹ گروپ میں مجھے زیادہ کشش محسوس ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ کانگرس کا باضابطہ ممبر بننے سے پہلے سوشلزم کی مبادیات سے میرا ذہن آشنا ہو چکا تھا۔ چناں چہ جلد ہی میں بڑی حد تک تو کیونسٹ بن گیا، لیکن میرا ذہن بنیادی طور پر کانگرسی ہی رہا۔ ایک زمانے میں مجھے اپنے متعلق یہ شبہ بھی ہو چلا تھا کہ کمیونزم نے میری کانگرسی رگ کو دبا لیا ہے، لیکن آگے چل کر میرا یہ گمان غلط ثابت ہوا۔

"ابتدائی دور ہی میں کمیونسٹوں کے طریق کار نے ایک موقع پر مجھے غیر محسوس طور پر متزلزل بھی کیا، لیکن یہ جھٹکا اتنا شدید نہیں تھا کہ میرے پیر اکھڑ جاتے۔ یہ قصہ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء کا ہے۔ اس وقت یوپی کانگرس دو غیر واضح گروہوں میں بٹی تھی۔ ایک رفیع احمد صاحب قدوائی کا گروہ تھا، اور دوسرا آچاریہ نرندر دیو کا، جو پکے سوشلسٹ تھے۔ سوشلسٹ پارٹی اور کیونسٹ پارٹی کا اگرچہ الگ الگ وجود تھا، لیکن کانگرس کے اندر ان دونوں میں مکمل اتحاد تھا۔ اس سال یوپی کانگرس کی صدارت کے لیے سوشلسٹ پارٹی نے دمودر سروپ سیٹھ کو اور ان کے مقابلے میں قدوائی صاحب نے موہن لال سکسینہ کو کھڑا کیا۔ الکشن سے ایک روز پہلے قدوائی صاحب نے کیونسٹوں کو، یہ وعدہ کر کے، توڑ لیا کہ وہ اگر موہن لال سکسینہ کو ووٹ دیں، تو نئی ایکزیکٹو کمیٹی میں دو تین کیونسٹوں کو بھی وہ لے لیں گے۔ یوپی، پراونشل کانگرس کمیٹی کے بیشتر مسلمان ممبر مولانا حفظ الرحمٰن کی قیادت میں بالعموم سوشلسٹوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ آچاریہ نرندر دیو کو یقین تھا کہ اس موقع پر بھی کیونسٹ اور مسلمان ان ہی کے امیدوار کو ووٹ دیں گے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ جمعہ کا دن تھا، اور تین بجے الکشن ہونے والا تھا۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب دہلی سے آئے تھے، لیکن جمعہ کی نماز کے بعد انھیں جلسے میں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ الکشن مقررہ وقت پر شروع ہوا تو کمیونسٹوں نے موہن لال سکسینہ کو ووٹ دیا اور مسلمانوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ دمودر سروپ بری طرح ہارے۔ اسی دن شام کو موہن لال سکسینہ نے ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبروں کے ناموں کا اعلان کیا تو قدوائی صاحب کے وعدے کے مطابق، اس میں دو تین کمیونسٹوں کے بھی نام تھے، اور دو سوشلسٹوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ دوسرے دن نئی ایگزیکٹو کمیٹی کا جلسہ تھا۔ میں ان دنوں پراونشل کانگرس کمیٹی کے دفتر ہی میں کام کرتا تھا۔ جلسے سے کچھ دیر پہلے ہمارے کمیونسٹ دوست وہاں تشریف لائے۔"

"کون کون تھے؟" مجید نے سوال کیا۔

"سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر اور شاید بھردواج بھی تھے۔ اس وقت تک انھیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ سوشلسٹ پارٹی کے ممبر موہن لال سکسینہ کی نئی ایگزیکٹو کمیٹی میں شریک ہوں گے یا نہیں۔ اس کی ٹوہ لینے کے لیے انھوں نے مجھے پکڑا۔ دفتر کے باہر لان پر کچھ دیر آپس میں صلاح مشورے کے بعد سجاد ظہیر میرے پاس آئے، اور مجھ سے کہا کہ میں جاکر آچاریہ نرندر دیو سے کہوں کہ سوشلسٹ پارٹی اگر نئی ایگزیکٹو کمیٹی میں شریک نہ ہوگی تو کمیونسٹ ممبر بھی اس کا بائیکاٹ کریں گے۔ ان دنوں پراونشل کانگرس کمیٹی کا دفتر اسٹیشن روڈ پر تھا، اور اس کے قریب ہی کونسلرس رزیڈنس میں آچاریہ نرندر دیو رہتے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو ان کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میرے کھٹکھٹانے پر دروازہ کھلا، تو سامنے موہن لال گوتم کھڑے تھے۔

"آچاریہ جی تشریف رکھتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں ہیں، آیئے" گوتم نے جواب میں کہا۔ آچاریہ جی اس وقت بغل کے کمرے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔

"کہئے، کیسے تشریف لائے؟" میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے لیٹے ہی لیٹے انھوں نے

کہا "معاف کیجیے، میری طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے لیٹ گیا ہوں"۔

"مزاج پرسی کے بعد میں نے پیغام سنایا، جسے سنتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا، اور وہ اٹھ بیٹھے۔ ان کو غصہ بہت کم آتا تھا، اور ان کی سنجیدگی و بردباری ضرب المثل تھی۔ لیکن اس وقت وہ آپے سے باہر تھے۔ ان کے منہ میں جو آیا، کہہ ڈالا۔

"میں تو پیام بر ہوں، میں نے کہا اور مشرقی روایات کے مطابق پیام بر کی گردن نہیں ماری جاتی"۔ یہ سن کر آچاریہ جی کا غصہ کچھ کم ہوا۔

"یہ باتیں میں نے آپ کو نہیں سنائی ہیں" اچاریہ جی نے معذرت کے لہجے میں کہا "میرے مخاطب تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو یہاں بھیجا ہے۔ میں نے جو باتیں کہی ہیں، وہ سب آپ ان کو میری طرف سے سنا دیجئے، اور یہ بھی کہہ دیجے کہ مجھے معلوم ہے کہ سوشلسٹوں کے بائیکاٹ کے باوجود کمیونسٹ موہن لال سکسینہ کی بنائی ہوئی ایکزیکٹو کمیٹی میں ضرور شریک ہوں گے"۔

اور یہی ہوا۔ اس کے بعد سوشلسٹ اور کمیونسٹ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکے۔

"میرا گمان ہے" مجید نے کہا "تم اگر کمیونسٹ نہیں تو ان کے شریکِ سفر ضرور تھے، اور ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو بھی تم یہی تھے، اور آج بھی یہی ہو، ورنہ تمھارے جسم پر یہ مکروہ برطانوی فوجی وردی نہ ہوتی"۔

"تمھارا فیصلہ بہ ظاہر جتنا صحیح معلوم ہوتا ہے، اتنا صحیح ہے نہیں" مجید کی تردید کرتے ہوئے میں نے کہا "۹ اگست ۱۹۴۲ء کا دن ہماری تاریخ میں کئی اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی ۹ اگست کو میرے جیسے لاکھوں نوجوانوں نے —— جو کانگرسی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی —— پہلی بار اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کیا کہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں دو دھارے متوازی بہہ رہے ہیں، جن میں اشتراک نہیں بلکہ تضاد ہے۔ ان میں سے ایک دھارا قوم پرستی کا ہے اور دوسرا کمیونزم کا۔ عین اس زمانے میں جب ملک کے کونے کونے سے 'ہندستان چھوڑ دو' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، میرے جیسے لاکھوں نوجوان 'آتش نمرود میں بے خطر کود نے' کی آرزو لیے

دم بخود کھڑے تھے۔ ہمارے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں کشمکش تھی، جنگ تھی، ایک طرف دل تھا، اور دوسری طرف عقل تھی۔ دل کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ سارا ملک جل رہا ہے، اور شعلے بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں۔ عقل کہہ رہی تھی کہ ملک ہی نہیں بلکہ ساری دنیا جل رہی ہے۔ ملک ہی کی فکر کی تو ساری دنیا بھسم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی وطن عزیز بھی جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

"یہ فریب تھا عقل فتنہ پرور کا" مجید نے حقارت اور غصے کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

"مگر سوچو تو!" میں نے پس پائی کے لہجے میں جواب دیا "یہ اگر فریب تھا عقل فتنہ پرور کا، تو کتنا حسین فریب تھا یہ!"

"حسن اور فریب میں تو چولی دامن کا ساتھ ہے" مجید نے بڑے تیکھے انداز میں کہا "اور اس کا منتہائے کمال یہ تھا کہ تم انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں جا پھنسے۔"

"نہیں، میں پہلے انڈین ایر فورس میں پھنسا" میں نے جواب دیا "اور وہاں سے اچھل کر انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں آیا۔"

یہ داستان بھی دلچسپ ہے۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں میں ایک ہڑتال کے سلسلہ میں گرفتار ہوا اور جیل بھیج دیا گیا۔ گرفتاری کے وقت میرے ہاتھ میں ایک فلسطینی عیسائی جارج انتونیس کی کتاب "عرب اویکننگ" تھی، جو اسی روز میرے ہاتھ آئی تھی۔ جیل کی فرصت سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس کی تلخیص کر ڈالی، جو جیل سے باہر آنے کے بعد نگار میں بالاقساط شائع ہوئی۔ اس نے میرے اندر بڑی خود اعتمادی پیدا کی۔ کیوں کہ نگار اردو کا چوٹی کا رسالہ تھا، اور اس میں کسی نو وارد بساطِ ادب کا داخل ہونا آسان نہیں تھا۔ نیاز صاحب نے بھی میری بہت ہمت افزائی کی۔ چناں چہ میں نے نگار میں پابندی سے لکھنا شروع کیا، اور دو ڈھائی سال تک مسلسل لکھتا رہا۔ اس دور میں نگار کے دو ہی چار شمارے ایسے ہوں گے جن میں میرا کوئی مضمون نہ ہو۔ بعض شمارے تو ایسے بھی ہیں، جن میں میرے دو دو تین مضامین ہیں ——— ایک میرے نام سے اور باقی ادارے کے یا کسی فرضی نام سے۔"

"یار! نیاز صاحب بھی خوب آدمی ہیں" مجید نے بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ لکھنؤ میں اتنے دنوں رہنے کے باوجود ان سے کبھی نہیں ملا۔ اب جب بھی گیا، ان سے ضرور ملوں گا۔"

"ضرور ملنا" میں نے کہا "نیاز صاحب کچھ دیر آشنا ہیں لیکن خوب آدمی ہیں۔"

"میں نے بعض لوگوں سے ان کے متعلق عجیب عجیب باتیں سنی ہیں" مجید نے سوال کیا "تمہاری کیا رائے ہے ان کے متعلق؟"

"میں تو اپنی رائے بیان کر چکا ہوں" میں نے جواب دیا "نیاز صاحب بہرحال انسان ہیں، ان میں کچھ خامیاں بھی ضرور ہوں گی، لیکن مجھے خامیوں سے زیادہ ان میں خوبیاں نظر آتی ہیں۔

"میں نے بھی نیاز صاحب کے متعلق طرح طرح کی باتیں سن تھیں، اس لیے پہلے پہل ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ قصہ اوائل اپریل ۱۹۴۷ء کا ہے۔ صدر دروازے کی کنڈی میں نے کھٹکھٹائی، جو اٹکایا ہوا تھا۔ اس کے جواب میں کسی نے اندر آنے کے لیے کہا۔ دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک چھوٹا سا صحن، اور اس کی بغل میں ایک برآمدہ تھا، جہاں ایک کونے میں تخت پر ایک کاتب بیٹھا کتابت کر رہا تھا۔

"نیاز صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔ جواب میں کاتب نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے دروازے پر چق پڑی تھی۔ میں نے چق اٹھائی۔

"تشریف لائیے" ایک بزرگ نے فرمایا۔

میں سمجھ گیا کہ یہی نیاز صاحب ہیں، کیوں کہ اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ایک بڑی سی میز کے سامنے کرسی پر وہ بیٹھے تھے۔ میز پر کتابوں کا انبار لگا تھا۔ میز ہی پر ایک بجلی کا لیمپ رکھا تھا جس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی تاریکی دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سلام کے بعد میز کے قریب پہنچا تو سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ بلا کسی تمہید کے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے اس کی بھی میں نے وضاحت کر دی کہ لکھنے پڑھنے کو پیٹ بھرنے کا شغلہ نہیں، بلکہ پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ نیاز صاحب نے میری بات غور سے سنی۔

"اچھی بات ہے"، مسودے کو میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے نیاز صاحب نے جواب دیا "آج ہی شام کو اس کا جواب آپ کو مل جائے گا"

"تو شام کو میں حاضر ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے"، انھوں نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا "میرا آدمی صدیق بک ڈپو میں خط دے آئے گا۔ وہیں کا پتہ آپ نے لکھا ہے نا؟"

"شام کو صدیق بک ڈپو گیا، تو میرے نام کا ایک خط وہاں رکھا تھا۔ میں نے بے تابی سے کھولا تو حسب توقع نیاز صاحب ہی کی تحریر تھی ــــ کاروباری انداز کی ایک مختصر سی تحریر، جس میں مضمون کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ بس اتنا لکھا تھا کہ مضمون بالاقساط نگار میں شائع ہو جائے گا۔ معاوضہ فی الحال آٹھ آنے فی صفحہ دیا جا سکے گا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی تھی کہ منظور ہو تو اس کی اطلاع دوسرے دن گیارہ بجے تک دے دی جائے، تاکہ اگلے مہینے کے شمارے میں پہلی قسط شائع ہو سکے۔

"معاوضہ میری توقع سے کم تھا، مگر فیصلہ کرنے میں مجھے دیر نہ لگی۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر میں پہنچا، اور بے چوں وچرا ان کی تجویز مان لی۔ اسی وقت انھوں نے کاتب کو بلایا، اور مسودہ کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا کہ یہ کتنے صفحے کا ہو گا۔ مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے اور سطروں کا حساب لگانے کے بعد اس نے ساٹھ صفحات کا تخمینہ بتایا۔ نیاز صاحب نے چک بک نکالی، اور تیس روپے کا چک لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ یہ تھا نیاز صاحب سے میرا پہلا سابقہ یا پہلا معاملہ۔ اس کے بعد بھی ان کا یہی دستور رہا کہ جب بھی میں نے کوئی مضمون ان کی خدمت میں پیش کیا، معاوضے کا چک انھوں نے اسی وقت کاٹ دیا۔ نقد پیسے کبھی نہیں دئے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد نیاز صاحب کو جب میرے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہو گیا تو کھل کر مختلف مسائل پر باتیں بھی کرنے لگے۔ اکثر خود ہی موضوع کا تعین کر کے مضمون لکھنے کی فرمائش بھی کرتے۔

"اسے اپنا لیجیے" کسی انگریزی رسالے کا ایک تراشا میرے حوالے کرتے ہوئے انھوں نے

فرمایا۔

"یہ فن مجھے نہیں آتا" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو آپ اس کا ترجمہ کر دیجیے"

دو مہینے بعد وہی مضمون نگار میں شایع ہوا، تو اس کا انداز بیان اس درجہ بدلا ہوا تھا کہ پڑھتے وقت میں یہ محسوس نہ کر سکا کہ یہ وہی مضمون ہے، جس کا میں نے ترجمہ کیا تھا۔ اس فن میں نیاز صاحب کا جواب نہیں تھا۔

"نیاز صاحب کی ہدایت کے مطابق، یا ان کے مشورے سے، میں نے بعض طویل مضامین ایسے بھی لکھے، جنھیں کسی مصلحت کی بنا پر وہ شایع نہ کر سکے، یا اس کا کچھ حصہ ہی شایع کیا، لیکن ایسے مضامین کا معاوضہ بھی انھوں نے پورا پورا ادا کیا۔"

"یار یہ تو بڑی قابل تعریف بات ہے" مجید نے کہا

"ہاں یقیناً قابل تعریف ہے" میں نے مجید کی تائید کی "میرے تجربے کے مطابق تو نیاز صاحب معاملے کے بہت کھرے ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے روس اور برطانیہ کے تعلقات سے متعلق برطانوی پارلی منٹ کے ایک لیبر ممبر زیلیاکس کی کتاب 'لائٹ آن ماسکو' آئی، جس میں برطانیہ کی خارجہ پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ نیاز صاحب کی اجازت سے میں نے اس کی تلخیص کر ڈالی، جو نگار کے، کم و بیش، اسّی پچاسی صفحات کی تھی۔ مسودہ میں نے نیاز صاحب کے حوالے کیا اور انھوں نے حسب دستور اس کا معاوضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد اتفاقاً میں لکھنؤ سے باہر چلا گیا، اور واپسی تین چار مہینے بعد ہوئی۔ نگار کا تازہ شمارہ جب ملا تو اس میں مضمون کی پہلی قسط 'اہم سیاسی انکشافات' کے عنوان سے، میرے نام سے نہیں بلکہ، ادارے کے نام سے تھی[1]۔ لیکن اس کی دوسری قسط جب آئی تو وہ میرے نام سے تھی، اور نیاز صاحب نے کمال یہ کیا کہ پہلی قسط کے بعد

---

[1] نگار، جولائی دسمبر ۱۹۴۴ء

جو مسودہ بچا، اور جو کم و بیش ساٹھ پینسٹھ صفحات کا رہا ہوگا، اسے کاٹ چھانٹ کر نو صفحات میں سمو دیا۔ اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ مضمون کے آخر میں ایک طویل نوٹ کا بھی انھوں نے اضافہ کیا، جس میں کتاب کی تنقیص کی گئی تھی۔

"نیاز صاحب! آپ نے تو غضب ہی کر دیا" لکھنؤ لوٹنے کے بعد احتجاجاً میں نے کہا "میرے مضمون کا تو بھرکس ہی نکال دیا آپ نے، اور رہی سہی کسر آپ کے نوٹ نے پوری کر دی۔"

"کیا کرتا" بے بسی کے ساتھ انھوں نے جواب دیا 'حکومت ہند کا عتاب نامہ آگیا تھا'

نیاز صاحب کا یہ بیان یقیناً صحیح تھا۔ اس وقت جنگ اپنے شباب پر تھی، اور حکومت ہندستانی پریس پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ میرا ایک طویل مضمون بھی حکومت کی اسی پالیسی کی نذر ہو گیا، جس کی صرف پہلی ہی قسط 'روسی نظام حکومت پر تبصرہ' کے عنوان سے شائع ہو سکی[1]۔ جنگ کے ذکر کے ساتھ ہی ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں نیاز صاحب نے جنگ نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے ایک طویل مضمون لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی جس میں پہلی عالم گیر جنگ کے اختتام سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک کے بین الاقوامی حالات کا سیر حاصل تبصرہ ہو۔ ان کی یہ فرمائش سن کر میں نے کہا کہ یہ تو خاصا بڑا کام ہے اور مضمون بھی کافی طویل ہوگا۔

"اس کی فکر آپ نہ کیجیے" انھوں نے جواب دیا "جتنا بھی طویل ہو، چھپ جائے گا اور معاوضہ بھی آپ کو دونا ملے گا۔ مگر مضمون پندرہ دن کے اندر تیار ہو جانا چاہیے۔"

"رات دن ایک کر کے مضمون معینہ مدت کے اندر میں نے نیاز صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے اس مضمون سے بھی بہت مدد ملی جو 'عربوں کی سیاسی بیداری' کے عنوان سے نگار ہی میں بالاقساط شایع ہو چکا تھا۔ اس کے بعض کام کے طویل اقتباسات بھی میں نے اس مضمون میں شامل کیے اور وہ مضمون بھی چوں کہ میرا ہی تھا اس لیے ان اقتباسات

---

[1] نگار، جولائی ۱۹۴۱ء

کا حوالہ دینا میں نے غیر ضروری سمجھا۔ اسی نمبر کے لیے ایک مضمون اور نیاز صاحب نے مجھ سے لکھوالیا لیکن جب یہ نمبر آیا تو پہلا طویل مضمون، بہ طور مقدمہ کے ملاحظات کی جگہ پر[1]، ادارہ کے نام سے تھا۔ دوسرے مضمون کا بھی یہی حشر ہوا[2]۔ لیکن سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اسی نمبر میں ایک مضمون میرے نام سے بھی تھا، جو میرا لکھا ہوا نہیں تھا[3]۔"

"اچھا یہ تو بتلاؤ" نگار کی داستان سے اکتا کر مجید نے گفتگو کا موضوع بدلا "انڈین ایرفورس سے چھلانگ لگا کر انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں تم کیسے پہنچے؟"

میں نے یہ قصہ تفصیل سے بیان کرنا شروع کیا، لیکن ابھی تمہید ہی تھی کہ دیکھتا کیا ہوں کہ مجید فرش پر لیٹے لیٹے خراٹے لے رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میں نے بھی خاموشی اختیار کر کے مجید ہی کی تقلید کی۔ دوسرے دن صبح کو آنکھ کھلی تو سات بج چکے تھے۔ مجید بدستور سو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی معصومانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جیسے بچوں کی طرح پرستان کے خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا، اور جلدی جلدی غسل کر کے دفتر کی راہ لی، جو آٹھ بجے سے شروع ہوتا تھا۔

دفتر پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ آج میرے ایک رفیق بیمار ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ پر مجھے تہران سے باہر ایک کیمپ تک جانا ہے جہاں سالانہ تقریب کے موقع پر کھیل کے مقابلے اور دوسرے تفریحی پروگرام ہیں خیال تھا کہ اسی دن لوٹ آؤں گا، لیکن وہاں سے واپسی دوسرے دن ہوئی۔ شام کو مجید کے ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو ۱۰ اگست ہی کو آبادان چلا گیا۔ چند روز کے بعد مجید کا ایک خط ملا جس میں اس نے اطلاع دی تھی کہ ملازمت سے اس نے استعفا دے دیا ہے، اور وطن واپس جا رہا ہے۔

---

[1] داستانِ جنگ۔ نگار اگست ۱۹۴۱ء

[2] اسی حکومت اور مزدور۔ نگار۔ اگست ۱۹۴۱ء

[3] سائنس اور جنگ۔ نگار اگست ۱۹۴۱ء

سلاح الدین نیّر

شرافت کا پھول

(نذرِ ذاکر حسین)

لاب، ایک ترو تازہ زندگی کا گلاب
ہک رہا تھا جو دلّی کے سبزہ زاروں میں
ہک رہا تھا جو کل لکھنؤ کی گلیوں میں
کن کی سانولی شاموں میں جن کی خوشبو تھی
ہک رہا تھا جو کشمیر کی فضاؤں میں
ودھ کی شام، بنارس کی صبح ساتھ لئے
ہاں کہاں نہ گیا عظمتِ وطن کے لئے
گر اک ایسی ہوا آئی صحنِ گلشن میں
من کی گود میں وہ پھول گر گیا یارو!

○

گلاب، ایک ترو تازہ زندگی کا گلاب
مہک تھی جس کی دلوں کے دبیز پردوں میں
مہک تھی جس کی نگاہوں کے آبشاروں میں
بسی ہوئی تھی مہک جس کی طرحداروں میں
مہک رہا تھا جو کٹیا میں اور محلوں میں
مہک کسانوں میں مزدور کے پسینوں میں
مہک تھی جس کی مشینوں میں کارخانوں میں
نہ کچھ کہا نہ سنا سب کو یوں ہی چھوڑ دیا
تمام عمر کے رشتوں کو یوں ہی توڑ دیا

○

تھکی تھکی سی ہے کیوں آج موجِ گنگ وجمن

نہ جانے تاج کی پلکوں پہ یہ نمی کیوں ہے

ایلورہ ، تاج ، اجنتا جو بولتے تھے کبھی

وہ آج سر بہ گریباں ہیں زندگی کے لئے

○

نگاہ دارِ ادب، علم وفن کا شیدائی

روایتوں کا امیں، عصرِ نو کا دلدادہ

کرم کا باب، شرافت کی بولتی تصویر

دیارِ فکر و نظر کا وہ قیمتی ورثہ

تمام عمر سلگتا رہا وطن کے لئے

لہو دیا تو چراغوں کو انجمن کے لئے

○

بہار آتی رہے گی چمن چمن کے لئے

بہت سی کلیاں گلوں کا لباس پہنیں گی

مگر وہ پھول جو کل آبروئے گلشن تھا

وہ پھول جس کی تھی خوشبو صبا کے دامن میں

وہ پھول جس کی مہک علم وفن کے سینے میں

وہ پھول جس کے تبسم سے کانپتی تھی خزاں

خزاں کی لہر سے مُرجھا گیا تو ہے لیکن

گلابِ تازہ کی ہر وقت یاد آئے گی

جہاں میں خوشبوِ شرافت کی پھیل جائے گی

○

وکٹر ہیوگو
مترجم: اخیار احمد

غروب آفتاب

.... آج شام سورج بادلوں کے پیچھے روپوش ہو گیا ہے
کل طوفان آئے گا ، شام ہوگی ، رات ہوگی ـــــ
پھر ہوگا سویرا ـــــ اپنی مدہم غبار آلود روشنی کے ساتھ
یونہی رات اور دن ہوں گے ـــــ وقت نہیں تھمے گا !

یہ دن یونہی گذریں گے ، گذرتے رہیں گے
سمندر کے آگے ، پہاڑوں کے سامنے ،
آب سیمیں پر ، جنگلوں میں ، ـــــ اور گردش کرتے ہیں
مردہ روحوں کے گیتوں کی طرح ـــــ جن سے ہمیں پیار ہے

آبشاروں کے چہرے ، پہاڑوں کی پیشانیاں
شکن آلود مگر تابناک ۔ اور پرانے سدابہار درخت ۔
پھر جوان ہو جائیں گے ۔ اور گردونواح کے دریا
ان پہاڑوں سے وہ مسلسل روانی پائیں گے جو انھیں سمندر کی آغوش میں
لے جاتی ہے

مگر میں ، ہر روز ، اپنا سر بے حد نیچا کیے
چلتا ہوں ۔ اور ۔ اس مسکراتے سورج کے نیچے ٹھٹھرتا ہوا ،
آخرکار جا ہی پہنچوں گا ، میلے کے درمیان
اس وسیع اور روشن دنیا سے کچھ کھوئے بغیر !

(فرانسیسی سے ترجمہ)

ڈاکٹر سیفی پریمی

محتسب ـــــ ایک شعری کردار

اردو غزل میں ناصح، واعظ، شیخ، زاہد اور محتسب بڑے جاندار کردار ہیں، ان کرداروں کی اپنی ایک شعری و ادبی فضا ہے، ایک تاریخ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اردو غزل پر تصوف کا گہرا اثر رہا ہے، تصوف اور شریعت کا مفہوم، فکر و عمل کے مختلف نشیب و فراز سے گذر کر، الگ الگ چند ایسی اصطلاحوں میں مقید ہو گیا کہ عبد و معبود اور طالب و مطلوب کے رشتے کو سمجھنے اور حقیقت کبریٰ تک پہونچنے کی یہ دو راہیں تسلیم کر لی گئیں۔ میر دردؔ ایک صوفی شاعر تھے اور اس سلسلے میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، ان کا یہ شعر مشہور ہے:

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا، ہم کنشتِ دل میں ہیں
دردؔ منزل ایک تھی، کچھ راہ ہی کا پھیر تھا

راہ کا یہ پھیر درحقیقت یہ تھا کہ تصوف کسی اور چیز پر زور دیتا تھا اور شریعت کسی اور چیز پر، صوفیا نے محض رسوم و ظواہر کی پابندی کو کبھی اصلِ مذہب تصور نہیں کیا، وہ اسے ظاہر داری تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب دل ٹھیک اور نیت پاک نہ ہو قربِ الٰہی میسر نہیں آسکتا۔ اسی لئے علمائے ظاہر ان کی نگاہوں میں کبھی نہ جچے۔ خوف اور انعام، سزا اور جزا کے تصور سے اگر عبادت کی جائے تو یہ عبادت بے کیف ہے۔ مجبوری کا زہد اور ترک علائق ایک کمزور قسم کا زہد اور ترک ہے، اصل ترک وہ ہے کہ قدرت کے باوجود لذات دنیوی سے منہ موڑ لیا جائے:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

تصوف نے دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیوی جاہ و حشم سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کی کوشش کی، ہاں اُس نے انسان کو بحیثیت انسان کے کبھی فراموش نہیں کیا، اسی لئے اس میں عفو و درگذر، محبت و الفت، انسان دوستی اور رواداری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ تصوف نے انسان کی اصلاح کو اپنا مطمحِ نظر بنایا لیکن شریعت نے سماج کی اصلاح کو اولین جگہ دی، اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نے حکومت اور حکومت نے شریعت کا سہارا ڈھونڈا۔ شعر و ادب میں بھی سماج کا آئینہ ہوتے ہیں تصوف اور شریعت نے مختلف علامتوں کے ذریعہ اپنے مقصد و منہاج کی نشاندہی کی، مثلاً روحانی کیف و مستی نے جب مادی اصلاح کا جامہ پہنا تو 'رندی' کی اصطلاح ظہور میں آئی اور اس کے مقابلہ میں شریعت نے احتساب اور محتسب کی اصطلاحیں دیں، اسی طرح صوفیانہ شاعری میں بادہ و ساغر، جام و مینا وغیرہ کی اصطلاحیں ہیں اور ان کے مقابلہ میں واعظ، شیخ اور فقیہ وغیرہ۔ صوفیوں کے یہاں جو اصطلاحیں ملتی ہیں وہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے تمام کی تمام عشق، محبوب کی طلب اور اس کی منزل سے متعلق ہیں، مثلاً میکدہ یا میخانہ سے حلقۂ مردانِ خدا مراد ہوتا ہے، میکش سے سالک اور مئے و بادہ سے کیفیاتِ قلبی، مینا سے وہ اذکار و اشغال مراد ہیں جو سالکانِ طریقت کے ذوق و شوق کو بڑھاتے ہیں۔

دو الگ راہوں کی حیثیت سے تصوف اور شریعت کے فرق کی روایت اردو غزل کو فارسی شاعری سے ملی اور اس میں خالص عجمی ذہن کی کارفرمائی رہی ہے۔ اردو غزل گوئی میں محبوب کی ذات کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ یہ درحقیقت تصوف ہی کا اثر ہے۔ وَلی اورنگ آبادی نے کہا ہے:

عزیز و باغ میں جانا نپٹ دشوار ہے مجھ کو
گل گلرو کی پائی ہے مجھے گلشن سے کیا مطلب

شریعت اور طریقت کے اختلاف کا نتیجہ ہی تھا کہ شاعروں نے شیخ اور محتسب پر طنز کرنے سے بہت پہلے یہاں تک کہنے کی جرارت کی کہ بقول میر:

عام ہے یار کی تجلی میر
خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

اس کے بعد معرفت کے مضامین میں شراب کے لوازم کا بھرپور استعمال ملنے لگا۔ میر ہی کا شعر ہے:

قربان پیالۂ مے ناب
جس سے کہ ترا حجاب نکلا

آتش کے نزدیک زندگی ہی شراب ہے اب بیچارے محتسب کی تقدیر کو کیا کہیے گا۔

خم خانۂ حدوث میں مستِ قدیم ہوں
طفلی میں مجھ کو نشۂ مے شیر سے ہوا

جگر مراد آبادی نے بھی محتسب کو یہ کہکر حیرانی میں ڈال دیا:

پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پیے جا رہا ہوں میں

رندی و احتساب کی کش مکش میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شیخ اور واعظ کے کردار کی عظمت ہمارے اخلاق اور سماج کی دین ہے لیکن محتسب کی بلند و بالا شخصیت در اصل اقتدار کا عطیہ ہے اس لیے سماج میں اس کی ذات سے ہیبت پیدا ہونے لگی اور اس کے خلاف جذبات کے اظہار میں احتیاط کو مد نظر رکھا گیا چنانچہ اردو غزل میں سماج کے اس موڈ کا اثر نمایاں ہے۔ شیخ، واعظ اور زاہد پر طنز کرنے اور مضحکہ اڑانے کا چلن ملتا ہے مگر محتسب کے معاملے میں دبی زبان ہی سے کچھ کہنے کا دستور رہا ہے۔ اردو غزل کے مطالعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ محتسب اقتدار کا سخت گیر اور جابر نمائندہ ہے پھر بھی اس کے سامنے بات تو کہی جاتی ہے مگر ذرا سنبھل کر اس محتاط انداز سے

یہ تعلق ثابت ہو جاتا ہے کہ عوامی ذہن اپنے اعمال پر اس احتساب کے لیے تیار نہیں ہے وہ اپنے مشرب میں آزادی کا خواہاں ہے اور اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوا ہے مثلاً میخانہ کی بقا کا تصور تمام رندوں کے سامنے رہا ہے۔ تیرؔ نے میکدہ کے استحکام اور محتسب کی سخت گیری کا اظہار کیا ہے:

کیا خرابی ہے میکدے کی ہل
محتسب اک جہان جاتا ہے

محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں　　دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

آگے چل کر محتسب کے کردار میں دو رنگوں کی آمیزش بھی ملتی ہے۔ ایک طرف وہ فرضِ منصبی کی بجا آوری میں دل آزار رہے مگر در پردہ میخانہ سے ساز باز بھی رکھتا ہے۔ ذوقؔ نے کہا ہے:

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا　　دیجے اک جام، تو ہے یار ابھی یاروں کا

اس سے برسرِ اقتدار طبقے کے کردار کی پستی اور عام کرپشن پر روشنی پڑتی ہے لیکن محتسب اپنی سخت گیری سے یاران میکدہ کے جذبات کو بری طرح مجروح کرتا رہتا ہے، اس کے احتساب میں بادہ نوشی پر پابندی کے ساتھ میخانہ کی بیحرمتی بھی شامل ہے جس پر رندوں کو بھی کافی غم و غصہ ہے اس کا اظہار داغؔ دہلوی کے یہاں ملتا ہے:

ستیا ناس محتسب کا ہو　　شیشہ پھینکا کہیں، گلاس کہیں

شعرائے متاخرین کے یہاں بھی محتسب کا یہ کردار باقی رہتا ہے لیکن ان شاعروں نے داغؔ دہلوی کی طرح محتسب کو مخاطب کرنے میں حد سے گزری ہوئی بیباکی اختیار نہیں کی اگرچہ میخوار کے جذبات، شراب کی حرمت، دل کی لہک مہک اور تخیلی فضا، سب کچھ داغ کے دور کی یادگار ہیں۔ جگرؔ مرادآبادی نے محتسب کو یوں مخاطب کیا ہے:

اے محتسب نہ پھینک، مرے محتسب نہ پھینک　　ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

ترقی پسند شعراء کے یہاں محتسب کے رویّہ سے اس طرح کی جھلاہٹ نہیں ملتی جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ ان کے یہاں محتسب کے کردار میں اقتدار کے جبر اور اس کے فلسفہ کی آگاہی ملتی ہے اقتدار اور عوامی ذہن کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک سچائی ہے کہ عوامی تحریک کو دبانے سے اس تحریک میں اور جان پڑتی ہے۔ فیض احمد فیض نے محتسب کے کردار کو اسی نفسیاتی پس منظر میں پیش کیا ہے:

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

محتسب کا نہایت واضح کردار ریاض خیرآبادی کے یہاں نظر آتا ہے۔ اردو غزل گوئی میں محتسب کی سخت گیری، احتساب، حد اور ہیبت کی تصویریں ریاض سے زیادہ کسی شاعر نے پیش نہیں کیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

محتسب آیا تو میں خُم پر گرا — خُم گرا، مینا گرا، ساغر گرا

اس شعر میں صرف ایک رند کی حالت کا بیان ملتا ہے لیکن پورے میخانہ کی ہل چل، ابتری اور سراسیگی کا عالم دیکھنے کے لیے یہ شعر سُنیے:

آیا جو محتسب، تو بنی رزم، بزمِ مے — مجروح خُم، شہید ہمارا سبو ہوا

محتسب کے جاہ وجلال اور ہیبت کے اثرات کو ریاض نے ایک نئے خیال میں پیش کیا ہے اور پیرایۂ اظہار بھی اچھوتا ہے:

تیرے آتے ہی ہو گئی پانی — اڑ گیا، محتسب! شراب کا رنگ

اس تخئیلی انداز کے بعد براہ راست سیدھے سادے اور سچے انداز میں محتسب سے مخاطبت کا منظر دیکھیے:

پی ہوئی مے نہ مرے ہونٹ پہ آجائے کہیں — محتسب ڈر سے ترے روح فنا ہوتی ہے

محتسب کے کردار میں رندوں پر جبر کے علاوہ دُختِ رز کی فروخت پر بھی پابندی کا بیان ملتا

ہے یہاں شاعر کے اظہار میں نہ تو شکوہ شکایت کا چلن ہے نہ جھلاہٹ کی نمود۔ چوں کہ یہ معاملہ براہ راست رند کی ذات سے متعلق نہیں بلکہ دوسروں کا ہے اس لیے اس میں صفائی کی نوعیت ہے۔ وکالت کا رویہ ہے اور مے فروشی کو ناجائز کسب معاش کی بجائے ایک فطری عمل قرار دیا ہے۔ داغ نے اس خیال کو نہایت خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے:

تقصیر مے فروش کی اے محتسب نہیں　　　یہ چیز اُڑ کے جاتی ہے میخوار کی طرف

جگر مراد آبادی نے محتسب کے کردار کو صرف اقتدار کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی شخصیت کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے۔ محتسب کا منصب جس کو تفویض کیا جاتا تھا اس کی انتظامی صلاحیت ہی اصل معیار نہ تھی بلکہ اس کی زندگی میں اعلیٰ قدروں کا پایا جانا بھی ضروری تھا مثلاً مزاج کی نفاست اور ذہنی سطح کی بلندی ــــ بعض شاعروں نے رندانہ جھلاہٹ میں اس طرف توجہ نہیں کی۔ جگر نے محتسب کی شخصیت کے اس رخ کو بھی پیش کیا ہے۔ جگر کی نظر میں محتسب ایک باشعور انسان ہے مگر اس کے یہاں زندگی کے دیسلے تجربوں کی کمی ضرور ہے۔ یہ شعر سنیئے:

مانا کہ محتسب بھی بڑا باشعور ہے　　　لیکن اُسے نزاکتِ غم کی خبر کہاں

جگر کے یہاں محتسب کے کردار میں کسی قدر نرمی کا بھی پتا چلتا ہے۔ انھوں نے محتسب کو بھی دعوت میکشی دینے کی کوشش کی ہے:

یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، یہ بہار　　　محتسب! آج تو شغل مے و میخانہ بھی

ریاض کے یہاں ایک مثال ایسی بھی ہے جس میں اقتدار اور عوامی ذہن کی آزادی کا ٹکراؤ کھل کر ہو جاتا ہے اور رند اس جسارت پر آمادہ ہے:

یہ موج مے ابھی تو جسم میں پیوست ہو جائے　　　دکھا دوں محتسب کو درّۂ تعزیر میخانہ

قومی انحطاط کے باعث معاشرے میں کردار کی بلندی قائم نہ رہ سکی اور اس کا اثر اقتدار، اخلاق اور مذہب کے نمائندہ کرداروں پر بھی پڑا۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کا کردار بھی اور کھوکھلا

بن گیا اس لیے محتسب کے سامنے دشواری پیدا ہوئی۔ رندوں نے اقتدار پر طنز کی اور شیخ کی مثال پیش کرکے امتناعِ شراب کو بے معنی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً ریاضؔ کا کہنا :

اے محتسبِ خلد کے اِس میں نہ اُس میں پھول   حجرہ وہ شیخ کا ہے یہ مجھ خاکسار کا

عدمؔ نے ایک شعر میں شیخ کو بنیاد بنا کر معاشرے پر بھرپور طنز کی ہے :

سبو گم ہو گیا تھا رات میخانے میں اک ساقی
سحر کو محتسب نے شیخ کی جامہ تلاشی لی

غرض دورِ حاضر میں اربابِ اقتدار اور رندوں کے کردار میں کوئی حدِ فاصل باقی نہیں رہی۔ محتسب، جو اقتدار کا نہایت خشک، سخت گیر اور جابر نمائندہ تھا وہ اپنے تمام ذاتی وصفاتی جوہر کھو بیٹھا۔ فیضؔ کے یہاں اس کا بیان ملتا ہے :

تمھیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آکے بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اُٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

اسی باعث ریاضؔ نے محتسب کے کردار پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اب اخلاقی قوت نہیں ہے نہ اجتناب کا انصاف پسند اور نڈر نمائندہ ـــــ احساسِ فرض کی جگہ اس کے مزاج میں سیاسی حکمتِ عملی کو دخل ہے، وہ اب رندوں میں پھوٹ ڈالنے کی مہم میں معروف ہے۔ محتسب کے اس عمل کو ریاضؔ نے لطیف طنز میں پیش کیا ہے :

پھوٹ سے پھوٹ پڑی رات کو میخواروں میں
محتسب خوب چلی، خوب چھنی یاروں میں

'خوب چلی' اور 'خوب چھنی' میں معنیٔ قریب اور معنیٔ بعید دونوں کا اظہار ہے مگر اصل مقصود بے پناہ مے نوشی ہی ہے۔

اس مقام پر محتسب اور رند کا رشتہ ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے رند کو اپنے ضمیر اور باطنی طہارت کے ادعا کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ محتسب کے اجتناب کو لایعنی سمجھتا ہے۔

ریاضؔ کی زبان سے رندوں کا دعویٰ سُنیے :

اے محتسب ریاضؔ تو اُن میکشوں میں ہے
سو غوطے کھائے حوض میں دامن بھی تر نہ ہو

اردو غزل گوئی میں محتسب کے کردار کے سہارے ہمیں اپنے سماج، قوم اور ملک کی اقتصادی، اخلاقی، سماجی اور انتظامی کیفیتوں کا پتا چلتا ہے، دورِ حاضر میں اشیاء کی نایابی کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ اقتدار کے نمائندے اس علم و احساس کے باوجود کہ بازاروں میں انسانی ضروریات کی اشیا ناپید ہیں، کساد بازاری عام ہے، مگر وہ اپنے منصب کی بقا و شادابی کے لیے اور عوام میں اپنا بھرم باقی رکھنے کے لیے، چہل پہل، دیکھ بھال، دوڑ دھوپ کی مہم جاری رکھتے ہیں۔ ریاضؔ نے ہمارے معاشرے کے اِس رُخ کی تصویر پیش کی ہے :

یہ محتسب ہے عبث گھر کو سونگھتا پھرتا
کہ بوند بھر بھی مے مشکبو نہیں باقی

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

اردو میں وہابی ادب   از خواجہ احمد فاروقی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم: اصل مضمون ۴۱ صفحات، مآخذ کی وضاحتی فہرست ۱۰ صفحات، کل ۵۱ صفحات۔ غیر مجلد، قیمت: دو روپے۔ تاریخ اشاعت: اگست ۱۹۶۹ء۔ ناشر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب، نہ تو کتاب ہے اور نہ کتابچہ ہی، بلکہ ۴۱ صفحے کا ایک مضمون ہے، جو مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ اگست ۱۹۶۷ء کے لیے انگریزی میں لکھا گیا تھا، اس کے بعد اس کا ترجمہ "نذر مقبول" میں شائع ہوا اور اب شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے بالکل شروع میں لکھا ہے:

> "میرے مقالے کا موضوع انیسویں صدی کے مجاہدین کی تحریک ہے جس کو عرف عام میں وہابی تحریک کہا جاتا ہے، لیکن جس کا سرچشمہ در اصل شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات ہیں، اس لیے اسے ولی اللہی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کے خط و خال کو اس کے ادب اور اس کے معاصرین کی تحریروں میں دیکھا ہے۔"

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اردو زبان کو آسان بنانے اور سلیس اسلوب تحریر دینے کا سہرا سرسید کے سر ہے، لیکن خواجہ صاحب کو اس سے اتفاق نہیں ہے، ان کے خیال میں اس کی ابتدا وہابی تحریک سے ہوئی ہے، لکھتے ہیں:

"ہمارے عام ادبی مورخوں نے وہابی ادب پر بہت کم توجہ کی ہے، لیکن سچ پوچھیے تو وہابیوں کی عسکری شکست کے باوجود، ان کا اسلوب تحریر خاصا مقبول رہا ہے، اس لیے کہ اس کی سرحدیں مستقبل سے مل گئی ہیں۔ یہ خیال کہ عوام تک پہنچانے کے لیے سادہ آسان طرز کی ابتدا سر سید احمد خاں نے کی، تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں۔ وہابی ادب کو موجودہ اردو نثر کے ارتقا میں ایک اہم مقام حاصل ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو دہلی کالج کی نثر اور سر سید احمد خاں کی تصانیف معرض وجود میں نہ آتیں۔ میں یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ سادہ و آسان نثر انگریزوں کی دین ہے، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے، اس کی ابتدا بھی وہابی مصنفین کی بدولت ہو چکی تھی۔" (صفحہ ۳۸)

بلاشبہ یہ مقالہ خلوص اور محنت سے لکھا گیا ہے، لیکن اردو میں کتابی صورت میں چھپوانے کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے، نظر ثانی کر کے اسے مزید مفید اور مدلل بنایا جانا چاہیئے تھا اور اس میں اس کی کافی گنجائش تھی۔ مثلاً وہابی تحریک کو فروغ دینے کے لیے جو نیم مذہبی اور نیم سیاسی کتابیں لکھی گئیں، ان کے بارے میں فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "وہ عوام کے فائدے کے لیے صاف اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں، اس لیے ان سے اردو کو تقویت پہنچی اور اس سے جدید نثر کے لیے زمین ہموار ہو گئی۔" (صفحہ ۳۹) یا اس سے پہلے موصوف نے لکھا ہے کہ "اس ادبی لٹریچر میں چنداں ادبی محاسن نہیں، تاہم اردو نثر کی تاریخ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہابی مصنفین اور اہل قلم نے اردو نثر کے پر تکلف اسلوب کو بالکل بدل دیا۔" (صفحہ ۳۷) یہ دعوے یقیناً صحیح ہوں گے، مگر جب تک ثبوت نہ دیے جائیں محض دعوے ہی دعوے ہیں۔ مقالے میں تو تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں رہی ہو گی، کتاب میں یہ کمی یقیناً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ان تمام کتابوں کا تفصیل سے جائزہ لینے کی اور اس نثر کے نمونے پیش کرنے کی ضرورت تھی، جو وہابی تحریک کے سلسلے میں لکھی گئیں اور جن کی بدولت اردو نثر کا رنگ بدلا۔

ایک جگہ خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ بات بھی اہم ہے کہ اس وہابی ادب کی اشاعت

میں ادب کے فروغ دینے میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک رہے ہیں" (صفحہ ۲۲) مگر خواجہ صاحب نے اس کے ثبوت میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ "حضرت شاہ ولی اللہ کے بیٹے حضرت شاہ رفیع الدین نے ایک مشہور کتاب فارسی میں لکھی ہے، اس کا نام ہے "تنبیہ الغافلین"۔ اس کا ترجمہ اردو میں یعنی زبانِ ہندی میں جہاں مل نے کیا ہے۔" (صفحہ ۲۲) ظاہر ہے محض یہ ثبوت اتنے بڑے دعوے کے لیے کہ وہابی ادب کے فروغ میں ہندو بھی شریک ہیں۔ بہت کمزور اور ناکافی ہے۔

اسی طرح وہابی تحریک کی ناکامی پر بحث کرتے ہوئے صرف ڈیڑھ پونے دو صفحے لکھے گئے ہیں۔ خواجہ صاحب نے لکھا ہے: "یہاں وہابی تحریک کی ناکامی کے اسباب کے متعلق چند جملے لکھنا ضروری ہیں۔" (صفحہ ۵۴) میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی بڑی تحریک کی ناکامی کے اسباب چند جملوں میں کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اگر خواجہ صاحب شاعر ہوتے تو میں سمجھتا کہ وہ ایک مصرع میں بات کہنے کے عادی ہو گئے ہیں، مگر انھوں نے تو "میر تقی میر" جیسی ضخیم کتاب لکھی ہے، انھیں تو ہر دعویٰ اور ہر بحث کا حق ادا کرنا چاہئے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے ناکامی کا پہلا سبب یہ بیان کیا ہے کہ "یہ تحریک جو توہمات کے خلاف وجود میں آئی تھی، خود اپنے ہی توہمات کا شکار ہو گئی۔" (صفحہ ۵۴) اس کے لئے خواجہ صاحب نے صرف ایک رسالہ کا حوالہ دیا ہے، میرے خیال میں مجاہدین کی اس مقدس تحریک کے لیے، جس کا سرچشمہ بقول خواجہ صاحب دراصل شاہ ولی اللہ کے افکار وخیالات ہیں، محض ایک رسالہ کا حوالہ کافی نہیں ہے اور یہ تو خواجہ صاحب کی بہت زیادتی ہے کہ انھوں نے جس رسالہ کا حوالہ دیا ہے خود انھیں کے بقول اس کا مصنف گم نام ہے۔ ممکن ہے کچھ ایسے لوگ ہوں جو سید صاحب کو ابھی زندہ سمجھتے ہوں اور ان کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ مہدی موعود کی حیثیت سے ظہور فرمائیں گے، مگر پوری تحریک پر یہ الزام لگانے کے لیے کہ خود اپنے ہی توہمات کا شکار ہو گئی، ٹھوس حوالوں اور ناقابلِ انکار دلائل کی ضرورت ہے۔

خواجہ صاحب ایک منجھے ہوئے ادیب اور مصنف ہیں، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان کے بارے میں کچھ کہا جائے، مگر ان کی زندگی ہی کی وجہ سے عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان

ے ایک شکایت تو یہ ہے کہ بے ضرورت مشکل زبان لکھتے ہیں، مثلاً پارلیمنٹ جیسے عام فہم لفظ کے لیے وہ پارلیان لکھیں گے۔ اس مقالے میں ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، مثلاً فوجی کی "مجو عسکری"، رسالہ کے لیے مجلہ یا بنیاد کے بجائے مبنیٰ، مگر میں ان الفاظ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جن کی صحت کے بارے میں مجھے شبہ ہے، مثلاً ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے: "ان خوارق وکرامات اور شرک ..." (صفحہ ۱۱) خواجہ صاحب نے جس مقصد کے لیے "خوارق" کا لفظ استعمال کیا ہے، میرے خیال میں تنہا یہ لفظ کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ "عادات" کا اضافہ کرنا چاہیئے، یعنی خارق عادت ہونا چاہیئے۔ معاشرت، مفاہمت اور مساوات جیسے الفاظ میں "باہمی" کا مفہوم موجود ہوتا ہے، ان کے ساتھ "باہمی" کا استعمال زائد از ضرورت ہے، مگر خواجہ صاحب نے ہر جگہ ان کے ساتھ "باہمی" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ جہاد کرنے والے کو "مجاہد" کہتے ہیں، خواجہ صاحب نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے، مگر ایک دو جگہ "جہادی" بھی لکھا ہے۔ صفحہ ۲ کے آخر میں ہے:

".. اخلاق اور اقتصادی اصلاح کے ذریعے ایک ایسا منصفانہ معاشرہ قائم کیا جائے جو قرآنی تعلیم، تقرب الی اللہ، ایثار و عمل، خدمت خلق، عدل و انصاف اور تربیت نفس کے ذریعے اجتماعی بیماریوں کا علاج کر سکے۔"

اولاً میں "منصفانہ معاشرہ" کا مطلب نہیں سمجھ سکا، دوسرے جب لفظ "معاشرہ" کے بعد اس کی وضاحت یا تعریف کے لئے بہت سے اسمائے صفات استعمال کئے گئے ہیں تو اس سے پہلے لفظ "منصفانہ" استعمال کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔

افعال ناقصہ کے بارے میں اردو میں کوئی ایک طریقہ رائج نہیں ہے، کوئی مبتدا کے مطابق فعل لاتا ہے اور کوئی خبر کے مطابق۔ اگرچہ مولوی عبدالحق مرحوم نے لکھا ہے کہ فعل مبتدا کے مطابق ہونا چاہیئے (قواعد اردو صفحہ ۲۴۳) مگر استعمال میں دونوں طریقے رائج ہیں، لیکن غالباً اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ ایک ہی شخص ـــــ اور ایک ہی تحریر میں ـــــ دونوں طریقوں پر عمل کرے۔ خواجہ صاحب نے ایسا ہی کیا ہے۔ کتاب کے بالکل شروع میں لکھتے ہیں: "... جس کا مرجع دراصل

شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات ہیں" اس جملے میں فعل خبر کے مطابق ہے مذکر مبتدا کے یعنی "سرچشمہ" کے لحاظ سے فعل نہیں ہے "افکار و خیالات" کے مطابق ہے۔ مگر صفحہ ۲۶ پر اس کے برعکس ہے۔ یعنی فعل کے مطابق ہے۔ لکھتے ہیں:

"وہابیوں کی سائنٹی فک ارتقا سے بے توجہی اور نئی ابھرنے والی قوتوں کی کارفرمائی سے بے اعتنائی بھی تحریک کی ناکامی کا بڑا سبب تھی۔"

یہاں فعل "سبب" کے لحاظ سے نہیں ہے، "بے توجہی" اور "بے اعتنائی" کے لحاظ سے ہے۔ یعنی ایک جگہ فعل خبر کے لحاظ سے ہے اور دوسری جگہ مبتدا کے مطابق۔ "شتر گربہ" کی یہ مثال کسی منجھے ہوئے ادیب کے یہاں نہیں ہونی چاہیے۔

تبصرہ خاصا طویل ہو گیا، مگر ایک گذارش اس کتابچے کی قیمت کے بارے میں بھی کرنی چاہتا ہوں۔ آج کل اردو کتابوں کی گرانی کی شکایتیں بہت عام ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ایک رجحان یہ ہے کہ ایک کتاب کی جو مناسب قیمت ہونی چاہیے اس سے تین گنی چار گنی مقرر کی جاتی ہے۔ افراد سے شاید ہم اس سلسلے میں کچھ نہ کہہ سکیں، لیکن جن اداروں کو حکومت سے امداد ملتی ہے، ان سے یہ شکایت ضرور کی جا سکتی ہے۔ زیر تبصرہ کتابچہ کی قیمت زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہونی چاہیے تھی، لیکن چونکہ حکومت کی امداد سے شائع کیا گیا ہے، اس لیے اس کی قیمت پچاس پیسے مقرر کرنی چاہیے تھی۔ دو روپیہ قیمت تو کسی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔ اِدھر حال میں شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کی بعض کتابوں پر نظر پڑی تو ان کی قیمتیں بھی معمول سے زیادہ تھیں۔ خواجہ صاحب سے درخواست ہے کہ غریب اردو زبان کی خاطر وہ اس پر ضرور نظرثانی فرمائیں۔

نثر کا حسن ـــــ میرے عہد کے صاحب طرز نثر نگار (حصہ دوم)

مرتبہ: ڈاکٹر عابد رضا بیدار

سائز ۲۲x۱۸/۸، حجم ۴۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: دس روپے، سال اشاعت: ۱۹۸۰ء

ناشر: رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶۔ کلاں محل۔ دہلی ۶

فاضل مرتب کے تعارف کے مطابق اردو میں جو صاحب طرز ادیب ہیں، ان کی تحریروں

کے نمونے مرتب کر کے شائع کردئے ہیں، بہ الفاظ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کو جو تحریریں پسند آئیں انھیں "نثر کا حسن" کے عنوان کے تحت کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ یہ دوسرا حصہ ہے، جس میں فاضل مرتب کے عہد کے صاحب طرز نثر نگاروں کے نمونے ہیں۔ چونکہ اس انتخاب میں صرف ذاتی پسند اور ذوق کو رہنما بنایا گیا ہے اس لیے ان میں ایک دو ایسے نثر نگار بھی نظر آئیں گے، جن کا بہت سے لوگوں نے نام بھی نہیں سنا ہوگا اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو معروف تو ہیں مگر انھیں صاحب طرز نہیں سمجھا جاتا۔ اس حصے میں حسب ذیل ادیبوں اور صحافیوں کے نثری نمونے شامل ہیں :

(۱) مجنوں گورکھپوری (۲) عبدالماجد دریا آبادی (۳) محمد عثمان فارقلیط (۴) طلحہ الباقی (۵) حبیب الرحمن صدیقی (۶) حامد عثمانی (۷) فکر تونسوی (۸) م یوسف (۹) قرۃ العین حیدر (۱۰) رفیع الدین احمد

مذکورہ بالا نثر نگاروں کا بہت اختصار کے ساتھ حاشیے میں تعارف کرایا گیا ہے اور جس طرح بعض انتخابات میں فیاضی سے کام لیا گیا ہے، اسی طرح تعارف میں بھی کہیں کہیں بہت بہت مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان تمام تعارفوں کی کتابت خود فاضل مرتب نے کی ہے، ان کے علاوہ قرۃ العین حیدر کی پوری تحریر بھی، جو ۹ صفحات میں آئی ہے مرتب کے قلم سے ہے۔

فروغ اردو ــــ محسن کاکوروی نمبر مرتبہ: محمد حسین شمس علوی

سائز $\frac{20 \times 30}{8}$، حجم ۱۹۷ صفحات، غیر مجلد، اس نمبر کی قیمت : تین روپے

سال اشاعت : اپریل۔جون ۱۹۷۰ء پتہ : ۳۷۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ (یوپی)

ماہنامہ فروغ اردو نے بہت سے مفید خاص نمبر نکالے ہیں، ان میں سے بعض بہت ضخیم ہیں، زیر تبصرہ نمبر بہت ضخیم تو نہیں ہے، مگر اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

حضرت محسن کاکوروی (۱۸۲۷ ــــ ۱۹۰۵) ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر تھے، مگر نعت گوئی میں انھوں نے امتیاز حاصل کیا، بقول فاضل مرتب "ایسا نہیں ہے کہ اردو شعراء میں نعت گو نہیں پیدا ہوئے یا دوسرے شعراء کے قصائد اور سرمایۂ نعت میں خوبیاں نہیں ہیں، لیکن محسن کی طرح کی [illegible] اے

اپنا فن نہیں بنایا، کسی نے اپنی پوری زندگی اسی کے لیے وقف نہیں کردی اور اردو شاعری کے اس پہلو کو اس طرح روشن نہیں کیا جیسا اس کا حق تھا۔" (اپنی باتیں صفحہ ۴) اس نمبر میں موصوف کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں مشہور ادیبوں کے مضامین اور پیغامات شامل ہیں۔ (عبداللطیف اعظمی)

ہم کماری — از صالحہ عابد حسین

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۹۲ صفحات، سال اشاعت: ۱۹۷۰ء۔ غیر مجلد، قیمت: دو روپے

ملنے کا پتہ: ایس۔ ایم بکڈپو۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

اس چھوٹی سی کتاب کے جاذب نظر سرورق پر آپ کی نگاہ ضرور ٹھہرے گی مگر ممکن ہے کہ مصورانہ مناظر اور اپنے انوکھے پن کی وجہ سے عنوان سمجھنے میں توقف ہو۔ پھر آپ کتاب کھولیں گے تو گمان ہے کہ نام کے بارے میں کچھ سوچنے لگیں۔ لیکن پیش لفظ کی چند ابتدائی سطریں پڑھتے ہی یقین ہے کہ آپ نام کی معنویت ضرور محسوس کریں گے اور شاید پھر پلٹ کر سرورق دیکھیں اور محظوظ ہوں۔ پیش لفظ کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

> "سنو فلیک" انگریزی کے مشہور مصنف پال گیلیکو کی مشہور کتاب ہے، بڑی دلکش اور پر اثر۔ ہم کماری کا خیال اسی کتاب سے مستعار لیا گیا ہے۔ "سنو فلیک" داستان ہے انگلستان کے ایک لکۂ ابر کی جس میں مصنف نے اس کی زبان سے اپنے دیس کی زندگی کی کامیاب تصویر کشی کی ہے اور ساتھ ہی برف کے اس ننھے سے ٹکڑے کی داستان حیات اس حسن و خوبی اور انوکھے انداز میں بیان کی ہے کہ وہ صرف اس کی ہی نہیں بلکہ ساری مخلوق کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔"

یہاں "ہم کماری" کا جنم ہمالیہ کے دامن میں ہوا ہے اور وادیٔ کشمیر سے اس کے سفر حیات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس داستان میں کشمیر کی زندگی کی بڑی حقیقی اور پر لطف جھلکیاں ملتی ہیں۔ پھر میدانی علاقے کے مناظر سامنے آتے ہیں اور شہری گہما گہمی کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔ اس دریائی سفر کا قدرتی بحر ناپیدا کنار کی آغوش میں ہوتا ہے۔ جیسے ہم کماری نے اپنی ابتدا کے بارے میں ہمیں بتایا تھا کہ "سخت سردی کے ایک

وہاں، جانے زمین سے کتنے میل اوپر، آسمان کی بلندیوں میں میرا جنم ہوا، بس ایک پل میں سب کچھ ہو گیا۔ ایک بادل کے سینے سے جیسے برفانی ہوائیں اِدھر اُدھر اڑائے پھر رہی تھیں میں وجود میں آ گئی۔ اسی طرح "ہم کماری" کی ثباتی ہی اس کا انجام بھی سنیے: "اب سمندر میرے نیچے تھا۔ بھڑکتے ہوئے سورج نے اب مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں اب سوکھ رہی ہوں، سکڑ رہی ہوں، تھوڑی دیر بعد کچھ بھی نہیں ہوگا، بس بھاپ کا ایک ننھا سا پر آسمان پر تیرتا نظر آئے گا ۔۔۔ میرے اوپر، بہت بلندی پر ایک سفید بادل اُڑ رہا ہے۔ کیا یہی ہے میری منزلِ مقصود؟ اور اب مجھے یاد آیا کہ میں پیدا بھی ایک بادل ہی کے سینے میں ہوئی تھی۔"

اِس حیاتِ مستعار کا سارا بیان نہ صرف پُرکیف ہے بلکہ جغرافیائی اور سماجی حالات کی سچی تصویر بھی ہے۔ صرف ایک جگہ معصوم سا سہو ہوا ہے۔ وادیٔ کشمیر میں عید کی دھوم دھام کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ "مسجد کی مینار سے ایک پروقار آواز بلند ہوئی۔ اذان کی آواز" (۲۳) لیکن عید کی نماز میں اذان نہیں ہوتی ہے! مگر یہ سہو، معصوم اس لیے کہلانے کا مستحق ہے کہ ہماری سماجی زندگی میں خواتین کو عید کی نماز سے سروکار نہیں ہے۔ ایک جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ "یہ وہی ماسٹر جی ہیں جن کا ہم شبیہہ بچوں نے بنا کر کھڑا کیا ہے" (۲۴) یہاں اگرچہ ہم شبیہہ مفہوم کے اعتبار سے بالکل درست ہے لیکن اُس سے ترجمے کی کچھ غرابت ٹپکتی ہے۔ عموماً ایسے موقعوں پر 'پتلا' استعمال کرتے ہیں۔

"ہم کماری" کی زندگی ہمارے سامنے یہ سوال کھڑا کر دیتی ہے کہ "ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟" مگر ساتھ ہی ساتھ یہ جواب بھی مل جاتا ہے کہ "جاوداں، پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی!" اور اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ مقصدِ ہستی کی نشان دہی بڑے لطیف انداز میں ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے آخری چند جملے یہ ہیں:

"اور اس سے پہلے کہ ہم اپنا جان جانِ آفریں کے سپرد کرے، اس نے جو آخری چیز محسوس کی وہ یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف جہاں، آسمان، ہر چیز سے ایک [illegible]
[illegible] جا رہی ہوں [illegible]

تھا باش ہم ــ شاباش ـــــ تو نے اپنا کام بہت اچھی طرح انجام دیا ــ آ واپس آ ــ گھر آ ـــ "

آخر یہ 'شاباش' کس بات کی ہے ؟ محبّت اور خدمت کی ! اب یہ ایک برف پارے کی زندگی ہو یا ہماری اور آپ کی ۔ بات اتنی ہی ہے ۔

محترمہ صالحہ عابد حسین نے اس داستان میں ہم گدازی کی بڑی مُوثر مثال پیش کی ہے ۔ یہ ایک کامیاب تمثیل نگاری کا نمونہ بھی کہلائی جا سکتی ہے ۔ وہ ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں ۔ سوانح نگار کہلانے کا بھی حق رکھتی ہیں اور بچّوں کے لیے بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے ۔ 'ہم کناری' میں اُن کی اِن تمام صفات کی نمود ملتی ہے ۔ اُن کی تحریریں نہ صرف زبان کا لحاظ اور 'پاسِ وضع' کا احترام ملتا ہے بلکہ اقدار کی آبیاری بھی پائی جاتی ہے ۔ 'ہم کناری' ان سب باتوں کا ایک ننھا سا نمونہ کہلانے کی مستحق ہے ۔ یوں تو ثانوی مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کو اس چھوٹی سی کتاب میں عام سائنس اور معلومات عامہ والی بات، لطافتِ زبان اور پیامِ عمل کے ساتھ ملے گی لیکن بڑوں کی دلکش نثر اور حسین منظر کشی کی لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ حیات اور مقصدِ حیات کا ادراک بھی ہو سکے گا ۔ (عبداللہ ولی بخش قادری)

تازہ کتاب

گاندھی جی ــــ اور ان کے خیالات

مرتبہ : عبداللطیف اعظمی

یہ کتاب اسی مہینے میں شائع ہوئی ہے ، اس میں اُن مشاہیر کے مضامین ہیں ، جنھوں نے گاندھی جی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اُن کے بارے میں یا اُن کے خیالات کے بارے میں جو کچھ فرمائیں گے وہ یقیناً مستند ہوگا ۔ ان فاضل مضمون نگاروں میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں :

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (۲) ڈاکٹر سید عابد حسین (۳) پروفیسر محمد مجیب (۴) ہمایوں کبیر [illegible] (۶) پیارے لال وغیرہ

[illegible] مضامین شامل ہیں ۔ قیمت : پانچ روپے



پھول کی طرح تر و تازہ
اگر جلدی امراض یا فساد خون کی شکایت ہو تو چہرہ پژمردہ نظر آتا ہے
خون صفا
پھوڑے پھنسی خارش اور داد سے نجات دے کر جسم اور چہرے کو پھول کی طرح تر و تازہ رکھتا ہے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Regd. No. D - 76 September, 1970

The Monthly J A M I A

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۶۲	بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۰ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

بمبئی کے ایک مخصوص حلقے کی یہ آواز کئی ماہ ہوئے دہلی میں سُنی گئی تھی کہ اردو کا رسم خط بدل دیا جائے اور اس کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کیا جائے، لیکن آج کل اس کا چرچا کچھ زیادہ ہے، الفرو ایشیائی ادیبوں کی عالیہ کانفرنس (نئی دہلی) کے موقع پر بعض ایسے ادیبوں کے خلاف جو اردو کے لئے دیوناگری رسم خط کے مبلغ ہیں مظاہرہ بھی ہوا، اور اس مظاہرے کو خاصی اور مناسب پبلسٹی بھی ملی۔ اردو کے جن ادیبوں نے اس کے رسم خط کے بدلنے کی بات کہی ہے، اُن میں سے ہمارے نزدیک کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے، تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح لوگ ایسی غیر سنجیدہ باتیں کہہ دیتے ہیں۔ لیکن، بہرحال، کہتے ہیں اور چند روز تک خاصی ہماہمی رہتی ہے۔

مذکورہ الفرو ایشیائی کانفرنس کے موقع پر جن لوگوں نے مظاہرہ کیا، انھوں نے خواہ مخواہ اس کی زحمت کی اور اپنے اعصاب کو جذباتی تشنج میں مبتلا کیا، جن کے خلاف یہ مظاہرہ تھا اُن میں سے ایک صاحب نے دسمبر ۷۹ء میں اردو کے فارسی رسم خط کے باقی رکھنے کے لئے وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی عدالت میں ہزاروں کے مجمع میں اردو کا مقدمہ دائر کیا تھا، باقی لوگ اردو کے ادیب تو ہیں مگر اردو زبان کی لسانی خصوصیات، اس کی تاریخ و روایات وغیرہ کو وہ علمی سطح پر دیکھنے اور پرکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، ایسے چند لوگوں کے خلاف، جو نہ معلوم کس مصلحت اور کون سے مفاد کے پیش نظر، کیا کہہ جائیں اور کر جائیں، مظاہرہ کرنا تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں، اردو کی تحریک میں ان کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں، اور بقول مدیر قومی آواز (لکھنؤ) ان کے خلاف مظاہرہ کرنا "ویسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مچھر کا مقابلہ کرنے کو توپ لے آئے۔"

کچھ لوگ ہیں جو سنجیدگی سے یہ سوچتے اور کہتے رہے ہیں کہ اُردو کا رسم خط رومن ہو جائے، لیکن وہ اس مسئلہ کو علمی و لسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، انھیں ایسا کرنے کی آزادی ہے، لیکن یہ بات طے ہے کہ اردو

والے اردو کا رسم خط بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس کا تعلق جذباتیت سے قطعی نہیں، بلکہ بعض ٹھوس حقیقتیں ہیں جن کی بنا پر اردو والوں کا یہ موقف ہے۔ اب اس دلیل میں کوئی وزن نہیں رہا کہ اردو کو رومن یا دیوناگری میں لکھا جائے تو اس کے مخالفوں کی مخالفت ختم ہو جائے گی، سوال ہے کہ رسم خط بدلنے سے مخالفوں کا عناد کیسے ختم ہو گا؟ مخالفت یا عناد اس بنا پر نہیں ہے کہ اردو کا رسم خط فارسی ہے، بلکہ اس کی بنیاد ہی کچھ اور ہے، یہ ایک خاص نقطۂ نظر اور رجحان ہے جو ہندستان کی تہذیب کو شدھ کرنے کا حامی ہے، راشٹریہ کرن کے نعرہ سے اس رجحان کے تمام گوشوں کی بخوبی ترجمانی ہو جاتی ہے، اردو ہو یا تاج محل، قوالی ہو یا قطب مینار، کھانے کے برتن ہوں یا پہننے کے لباس، سب اس کی زد میں ہیں، اس لئے یہ سمجھنا کہ اردو کو دیوناگری میں لکھنے سے اردو کا مسئلہ حل ہو جائے گا محض ایک خیال ہے۔

اس مسئلہ کے مالہٗ وما علیہ پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس پر مزید خامہ فرسائی بیکار ہے، بس یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اردو کے رسم خط بدلنے کی تحریک قابل عمل نہیں ہے، اُدھر سندھی زبان کے فارسی رسم خط بدلنے کا مطالبہ بھی کچھ لوگ کر رہے ہیں، جو لوگ اس مطالبہ کے حق میں ہیں ان میں کاکا کالیلکر صاحب بھی ہیں، انھوں نے ابھی حال میں اس سلسلہ میں بلائی گئی ایک کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے وہی بات کہی جو بعض لوگ اردو کے بارے میں کہتے ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ "سندھی بھاشا کی لپی دیوناگری کر دی جائے، تب ہی یہ زندہ رہ سکتی ہے ورنہ اس کا کوئی بھوشیہ نہیں ..... سندھی کے خلاف جو سب سے بڑی بات کام کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسے علاقہ سے سمبندھت ہے جو آج ہندوستان کا حصہ نہیں، اس لئے سندھی کو ہندوستانی بھاشا سمجھتے وقت دماغ پر ذرا الوجھ پڑتا ہے۔" 'راشٹریہ کرن' کے حامی ایک معاصر نے شری کاکا کالیلکر کے سجھاؤ کا پرزور سواگت اور سمرتھن کیا ہے اور لکھا ہے کہ "فارسی لپی کی سندھی بھاشا کے لئے اب اس دیش میں کوئی گنجائش نہیں ہے .... فارسی رسم الخط کے سمرتھکوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ جب اردو جیسی بھاشا کا بھوشیہ انشچت (غیر یقینی) ہو رہا ہے تو سندھی کا بھوشیہ کتنا سُرکشِت (محفوظ) اور نشچت (یقینی) ہو سکتا ہے۔"

سندھی کے ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت کا کہنا ہے کہ کچھ سیاستداں اور بیوپاری ہیں جو سندھی زبان کا رسم خط بدلنے کی بات کرتے ہیں، ادیبوں اور شاعروں اور عام سندھی بولنے والوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں، ۲۰ر نومبر کو آلیفر و ایشیائی مصنفوں کی کانفرنس کے سلسلہ میں آئے ہوئے روسی ادیبوں سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے سندھی زبان کے ایک ادیب نے سندھی کے لئے فارسی کی جگہ دیوناگری رسم خط کو استعمال کرنے کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ ناگری رسم خط سندھیوں کو اس لئے قبول نہیں ہو سکتا کہ سندھی زبان کی کچھ آوازوں کو ادا کرنے والے حروف ناگری میں نہیں ہیں، نہ ناگری میں ان آوازوں کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسن خاں صاحب کا بہت ہی دلچسپ مضمون بعنوان 'میرا صفحہ' ۱۵ر نومبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں ملاحظہ کیجئے، مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ "تقسیم ہند سے قبل ہندی کتب میں عربی فارسی سے ماخوذ آوازوں کے لئے مختلف حروف کے نیچے نقطے لگا کر ان کے تلفظ کو ظاہر کیا جاتا تھا .. تقسیم ہند کے بعد ہندی ساہتیہ سمیلن جیسی انجمنوں نے یک لخت محسوس کیا کہ ہندی کو ان آوازوں سے 'شدھ' کرنا اس کو 'بھارتی' (وہ نام جو ہندی کے لئے تجویز ہو آیا ہے۔) بنانے کے لئے ضروری ہے.... چنانچہ نقطے لگانے کا طریقہ ختم کر دیا گیا... وہ بچے بھی جن کی مادری زبان اردو ہے ان آوازوں کو صحیح مخرج سے نہیں نکال پاتے ... چنانچہ جب کبھی یہ تجویز میرے سامنے آتی ہے کہ اردو کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کر لیا جائے تو میں بے اختیار اردو کے پسندیدہ اشعار کو اس رسم خط میں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور پھر انہیں بے نقط ہندی کے لہجہ میں گنگنا کر عبرتناک مزہ کا لطف لیتا ہوں" : مثلاً

کیسے کھبر کہ ہجاروں مکام رکھتا ہے — وہ پھکر جس میں ہے بے پردہ روج گرآنی
کید میں ہے ترے وحشی کو وہی جُلپھ کی یاد — ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ جنجیر بھی تھا
نہیں کہ مجھ کو کیامت کا اعتکاد نہیں — شب پھراک سے روج ججا جیاد نہیں
پھرصتِ کاروبارِ شوک کِسے — جوکِ نجارۂ جمال نہیں

۸ر نومبر کو مولانا محمد ابراہیم الوری کا انتقال ہو گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ قارئین جامعہ میں کم ایسے ہوں گے جنھیں مولانا مرحوم کے مجاہدانہ کارناموں کا علم ہو، لیکن دہلی، نواح دہلی، میوات اور راجستھان کے خاصے بڑے علاقے میں ان کی بے لوث خدمت گزاری، غیرت ایمانی اور جرات وبیباکی کی دھوم تھی، تقسیم ملک سے پہلے وہ جنگ آزادی میں پیش پیش تھے، کئی بار جیل گئے، ان کا پیر توڑا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں پہونچائی گئیں، لیکن آزادی کے اس متوالے کے پائے ثبات میں کبھی کوئی لغزش نہیں ہوئی، تقسیم کے موقع پر بھرت پور اور الور میں مسلمانوں پر جو قیامت گذری وہ معلوم ہے۔ بے شمار مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے، کچھ انگریزی علاقے میں پناہ گزیں ہوئے اور ہزاروں پاکستان چلے گئے، اس سے کہیں زیادہ مرتد ہو گئے، سیکڑوں مسجدیں ویران اور تباہ ہو گئیں اور اُن پر دوسروں نے قبضہ کرلیا، چھوڑی ہوئی جائدادیں بھی نکل گئیں اور اُن پر پاکستان سے آئے ہوئے برباد و تباہ حال شرنارتھیوں کا قبضہ ہو گیا ۔۔۔۔۔ اس قیامت کی افراتفری میں مولانا محمد ابراہیم مرحوم نے اس علاقہ میں وہی کام کیا جو مرحوم مولانا عطاالرحمٰن صاحب نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دہلی میں کیا تھا۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب غریب تھے لیکن دل بہت بڑا رکھتے تھے طبیعت میں بہت سادگی تھی لیکن اپنے علاقے کے مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔ لباس بہت سادہ تھا، بس شرعی پاجامہ، موٹا کھدر کا کرتا اور سر پر مولویانہ ٹوپی، لیکن بڑے سے بڑے شخص، رہبر اور عہدہ دار سے وہ خودداری اور ایک خاص بانکپن سے ملتے تھے، آج وہ نہیں ہیں تو ان کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، بڑی خوبیاں تھیں مرحوم میں، ان کے سارے اکابر ان کی قدر اور عزت کرتے تھے انھوں نے مدرسۂ امینیہ (دہلی) سے سند فراغت حاصل کی تھی، بہت اچھے حافظ تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند کرے اور میوات کے دوسرے کارکنوں کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

معین الدین حارث

خطبۂ صدارت

طلبائے قدیم کے لئے دعوتِ فکر و عمل

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن زریں کے موقع پر ۲۹ راکتوبر ۱۹۷۰ء کو جامعہ کے طلبائے قدیم کا ایک جلسہ ہوا، جلسے کی صدارت جناب معین الدین حارث صاحب، ایڈیٹر روزنامہ اجمل (بمبئی) نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطبہ پڑھا وہ درج ذیل ہے"

برادران جامعہ، بزرگو اور دوستو!

ہماری مادر تعلیمی جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کی شفقت بھری گود میں ہمیں تربیت پانے کا موقع حاصل ہوا اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کرکے اپنا جشن زریں منا رہی ہے۔ ہم سب کے لئے یہ موقع غیر معمولی مسرت و انبساط کا موقع ہے۔ اس مبارک و مسعود موقع پر جامعہ کے طلبائے قدیم کے اس اجتماع کی صدارت کا اعزاز آپ نے مجھے بخشا اس پر میں انجمن طلبائے قدیم جامعہ ملیہ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے مجھ سے کہیں زیادہ موزوں رفقاء اس اجتماع میں موجود ہیں اور انھیں اپنے سامنے موجود پاکر میں یک گونہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔ بہتر ہوتا کہ آپ یہ ذمہ داری میری بجائے ان میں سے کسی اور ایسے ساتھی کو سونپتے جو میرے مقابلے میں جامعہ کے ابتدائی دور میں اس سے زیادہ

قریب رہے ہیں اور جو سَابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں بعض رفقاء ایسے بھی ہیں جنھوں نے جامعہ میں اپنی طالب علمی کا دور ختم کرنے کے بعد اپنی پوری زندگی جامعہ ہی میں گذاری ہے۔ ہمیں جن مسائل پر غور کرنا ہے ان پر وہ میرے مقابلے میں کہیں زیادہ روشنی ڈالنے کے اہل ہیں مگر غالباً آپ کی نظر انتخاب مجھ پر اس وجہ سے پڑی ہے کہ جامعہ کے گذشتہ نصف صدی کے کام اور موجودہ ہندوستان میں اس کے رول پر ابتدائی کچھ عرض کرنے کے لئے ان لوگوں میں سے کسی کو ترجیح دی جائے جو جامعہ سے بہت زیادہ قریب نہ رہے ہوں تاکہ وہ جامعہ کے کام کا جائزہ زیادہ غیر جانبداری سے لے سکیں۔ میری دشواری یہ ہے کہ جامعہ سے ہزار بارہ سو کیلومیٹر کے جغرافیائی بُعد کے باوجود اپنی طالب علمی کے دور کو ختم کرنے کے بعد میں جامعہ سے بہت دور یا قطعاً غیر متعلق نہیں رہا ہوں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ جامعہ کے باب میں میرا حصہ صرف دور کا جلوہ رہا ہے۔ نہ معلوم میں اس کام کو کس حد تک غیر جانبداری سے انجام دے سکوں پھر بھی کوشش اسی کی کروں گا۔

یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ میں نے آپ کی مشفقانہ دعوت اس لئے منظور کی کہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ اس اجلاس کی صدارت بڑی حد تک رسمی اور خانہ پُری کی بات ہوگی اور اس صحبت میں ہمیں غور و فکر کے۔ ممکن ہو سکے تو اس مختصر وقت میں جامعہ کے کام کا سرسری جائزہ لینے کے۔ اور اس کے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کی صفائی کے جن مراحل سے گذرنا ہے اس کام میں آپ سب میرے شریک سفر ہیں اور مجھے علم ہے کہ میرے علاوہ اور متعدد ساتھی بھی اسی موضوع پر اظہار خیال کرنے والے ہیں۔

برادرانِ جامعہ! قبل اس کے کہ میں اس موضوع کے متعلق کچھ عرض کروں مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے ان بزرگوں کو یاد کروں جنھوں نے وطن عزیز کی تحریک آزادی کے پرآشوب دور میں جسے تاریخی اعتبار سے تحریک خلافت یا عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک کا دور کہا جاتا ہے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی۔ انہی کے ساتھ جامعہ کے اس ابتدائی دور کے جس سے میرا بحیثیت ایک طالب علم کے تعلق رہا ان شفیق اور محترم اساتذہ کرام کو یاد کروں جنھوں

نے ہمیں زیورِ علم سے آراستہ کیا، ہمارے ذہنوں کو جلا بخشی اور ہمارے کردار کی پختگی میں حصہ لیا۔ اپنے ان ساتھیوں اور ہم سبق دوستوں کو بھی یاد کروں جن کی رفاقت نے ان کاموں میں مدد دی اور پوری زندگی پر ایسا اثر ڈالا جسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ ایک اچھی اور بامقصد اور بلند مقصد اقامتی درس گاہ کی گود میں ہم نے جو مدت گزاری وہ آج اس موقع کی مناسبت سے ہمیں خصوصیت کے ساتھ یاد آرہی ہے۔ اس طویل مدت میں ان میں سے بہت سے ہم سے جدا ہو گئے اور اپنے اپنے مقررہ وقت پر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی روحوں کو سکون عطا کرے اور ہم میں سے جو باقی ہیں ان سب کا انجام بخیر کرے۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں جو یاد زیادہ شدت سے آتی ہے وہ جامعہ کے تعلیمی قافلے کے سالار استاد محترم ذاکر صاحب مرحوم ہیں جن پر علامہ اقبال مرحوم کی ع "نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز" والی تعریف سو فی صدی صادق آتی ہے اور اسی رختِ سفر کی فراوانی کے ساتھ وہ جامعہ کے میرِ کارواں کے فرائض زندگی بھر انجام دیتے رہے۔ ذاکر صاحب کی جدائی کا غم ہم سب کے لئے ہنوز تازہ ہے اور یہ خیال مزید تکلیف و رنج کا باعث کہ اس مبارک اور تاریخی موقع پر وہ ہم میں نہیں ہیں ان کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ جانے سے ہم نے اپنے آپ کو یتیم محسوس کیا اور ایک لحاظ سے جامعہ بھی یتیم ہو گئی۔ مگر میں نے انہی کی زبانی سنا تھا کہ یتیمی گو بہت بڑی مصیبت ہوتی ہے مگر ان کے لئے جو صبر سے کام لیتے ہیں یہ چیز رحمت بن جایا کرتی ہے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ تاریخ اسلام پر نظر ڈالی جائے تو ایسے باکمال بزرگوں کی ایک فہرست تیار کی جاسکتی ہے جنھوں نے یتیمی کا داغ سہا تھا مگر شاید یہی صدمہ ان کے لئے جان لیوا ثابت ہونے کی بجائے جان نواز بن گیا۔

فرد کی زندگی میں یتیمی کا تعلق بچپن یا سنِ شعور سے پہلے سایۂ پدری کھونے سے ہوتا ہے مگر اداروں کے ایسے سرپرست اور کھیون ہار جنھوں نے زندگی بھر ان کی نگرانی کی ہو جب اٹھ جاتے ہیں تو اس پورے ادارے پر یتیمی طاری ہو جاتی ہے۔ جامعہ پر اور ہم سب پر

پارسال یہی صدمۂ عظیم گذرا اس لحاظ سے ذاکر صاحب مرحوم کی جدائی ہم سب پر شاق ہے مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ اپنی زندگی بھر کی کوشش اور ان تھک محنت سے جامعہ کو ایسا بنا گئے ہیں اور ہم سب کو ۔۔ انھیں بھی جنھیں ان سے قریب ہونے کا شرف حاصل رہا اور انھیں بھی جنھیں اس شرف سے کم حصہ ملا ۔ اتنا کچھ دے گئے ہیں کہ اگر ہم اسے محفوظ رکھیں اور جن مختلف مراحل سے ہمیں ابھی گذرنا ہے ان میں انہی کے اُسوۂ حسنہ کو اپنے لئے نمونہ بنائیں تو ہم اپنی تمام مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں ۔ میری دعا ہے کہ ربِّ کریم انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے اس عالمِ جاودانی میں ان کے درجات اور بلند کرے اور جس جامعہ کی خاک میں وہ اب ابدی نیند سو رہے ہیں اس کے کارکنوں اور متعلقین کو یہ توفیق نصیب ہو کہ وہ ان کے فیض سے استفادہ حاصل کرتے رہیں ۔ ذاکر صاحب ضرور ہم سے جدا ہو گئے مگر جامعہ والوں کے لئے وہ بڑا لازوال سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جو ہر مشکل وقت میں ان کی مشکل کشائی کا باعث بن سکتا ہے ۔

گذرے ہوئے تمام بزرگوں اور دوستوں کو نام بنام یاد کرنا تو مشکل ہوگا کیونکہ نصف صدی کی اس طویل مدت کی طرح یہ فہرست بھی کافی طویل ہوگی مگر بلا ان میں کسی فرق کے خیال کے جامعہ کے اس ابتدائی دور سے جو ہم میں سے بہت سوں کی جامعہ میں طالب علمی کا زمانہ تھا اپنے اس دور کے اساتذہ میں سے خواجہ عبدالمجید مرحوم، مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم، مولانا محمد اسورتی مرحوم، خواجہ عبدالحی فاروقی مرحوم، مولانا سید شرف الدین مومن مرحوم، پروفیسر طاہر الیس محمدی مرحوم، پروفیسر اِی۔ جے۔ کیلاٹ مرحوم، حافظ فیاض احمد صاحب پانی پتی مرحوم، آپا جان فلپسبورن مرحوم خصوصیت سے یاد آتے ہیں ۔ جب اپنے ہم سبق ساتھیوں کی یاد آتی ہے تو برادر محترم شفیق الرحمان قدوائی مرحوم کی دلآویز شخصیت آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور انہی کے ساتھ مولانا اسعد ندوی مرحوم، ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف مرحوم، اختر حسن صاحب فاروقی مرحوم، اکبر علی صاحب مرحوم اور ناظم مکتبہ جامعہ حامد علی خاں مرحوم یاد آتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ

ان سب کو اور ہمارے ان تمام ساتھیوں کو جو ہم سے جدا ہو چکے ہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

اس دور کے اور طلبائے قدیم بھی یاد آتے ہیں، جو جامعہ میں طلبا کی تعداد بمقابلہ اور یونیورسٹیوں کے کم ہوتے ہوئے بھی ملک کے مختلف گوشوں سے آئے تھے اور حافظے پر تھوڑا سا بھی زور ڈالا جائے تو کشمیر کے سعید رضا، سرحد کے عبدالکریم، پنجاب کے نذیر نیازی، محمد علی، عبدالقادر سیالکوٹی، اتر پردیش کے حافظ منظور اور عبدالقادر جونپوری، بہار کے عبدالباقی صاحب مرحوم، مولوی منصورالحق، قاضی سعید، مدھیہ پردیش کے حبیب داد خاں، گجرات کے اسمٰعیل احمد، سندھ کے احمد سندھی اور عبدالواحد، میسور کے عبدالقدوس صاحب، حیدرآباد یا آندھرا کے محمود علی صاحب، اکبر علی صاحب اور انور خاں صاحب، آسام کے محبوب صاحب اور کیرالا کے محمد صاحب اور مہاراشٹر کے ڈاکٹر عبدالحمید زبیری مرحوم یاد آتے ہیں۔

موجودہ جامعہ میں مختلف مذہبی عقائد کے طلبا پائے جاتے ہیں مگر یہ خیال نہ ہو کہ جامعہ کا ابتدائی دور اس خصوصیت سے خالی تھا یا یہ کوئی بعد میں پیدا شدہ بات ہے۔ اس پرانے دور کے اپنے ساتھیوں میں سے جن میں سے بعض ناموں کا میں نے ابھی ذکر کیا اتنی ہی آسانی سے میں چندر بھان جوہری مرحوم، ڈاکٹر کیلاش ناتھ ٹوپا، سی۔ کے۔ نایر ان کے بھائی ہرچرن نایر، کنک چندر ڈیکا اور جنگ بہادر سنگھ کے نام لے سکتا ہوں۔

پھر سوال صرف ان ناموں کے یاد آنے کا نہیں بلکہ اس ملی جلی، مہذب اور کئی لحاظ سے مثالی زندگی کا ہے جو ہم نے ان دنوں جامعہ میں گذاری اور جس نے حصول علم کے ساتھ ہم میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کے جذبے کو بھی بیدار کیا اور تقویت بخشی جس جذبے نے ہمارا زندگی بھر ساتھ دیا۔

کسی تعلیمی ادارے کی کامیابی کو ناپنے اور تولنے کا ایک ذریعہ اگر اس کے فارغ التحصیل طلبا کی زندگیوں پر نظر ڈالنا ہو اور اس لحاظ سے جامعہ کے اس ابتدائی دور کے طلبا کا جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کی جامعہ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے لئے نمایاں مقام پیدا

کرنے والے طلبا اور گریجوایٹ پیدا کئے ۔ ان ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہوگی۔ بطور نمونہ اس ضمن میں ذاکر صاحب مرحوم کے دونوں بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ، ڈاکٹر کے، ایم، اشرف، ڈاکٹر عبدالعلیم احراری، سید محمد جعفری، ڈاکٹر محمد سرور ازہری، پٹنہ کے ڈاکٹر قاضی سعید، سعید انصاری صاحب، ڈاکٹر ٹوپا، جنگ بہادر سنگھ اور دوسرے بھی نام لئے جاسکتے ہیں جن میں سے بعض نے یورپ و امریکہ جاکر وہاں کی شہرہ آفاق جامعات کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور جنھیں یہ موقع نہ مل سکا انھوں نے اندرون ملک ہی جامعہ کی تعلیم اور اپنے حاصل کردہ تجربے سے اپنا اپنا مقام پیدا کیا کسی نے معلمی کے پیشے میں کسی نے صحافت میں اور بعض نے سیاست میں، اگر یہ بھی اضافہ کردوں تو اچھا ہوگا کہ اس دور کے جن جامعی طلبا نے سیاست میں حصہ لیا ان کی سیاست اصولی سیاست تھی اس میں موجودہ دور کی بے اصولی کے داغ دھبے نظر نہیں آتے اور ان کی اس اصول پروری اور استقامت میں جس کا ان میں سے اکثر نے ثبوت دیا اس تعلیم و تربیت کو ضرور دخل تھا جو انھوں نے جامعہ میں حاصل کی تھی ۔

برادران گرامی! نصف صدی یا پورے پچاس سال کی مدت خاصی طویل ہوتی ہے ۔ انسانی عمر کے لحاظ سے تو یہ مدت ایک پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے ۔ آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں اوسط عمر اس مدت کا بمشکل نصف تھا اور اب آزادی کے بعد کی ربع صدی میں اس میں معتدبہ اضافہ ہونے کے باوجود اب بھی ایک ہندوستانی کی اوسط عمر پچاس سال سے کم ہی ہے۔ مگر جہاں تک اداروں کی زندگی کا تعلق ہے یہ مدت بھی بہت زیادہ طویل نہیں کہی جاسکتی ۔ کیونکہ اداروں کی عمر اگر وہ جاندار اور اچھے ادارے ہوں اور اوائل عمر ہی میں موت کا شکار نہ ہوگئے ہوں تو ان کی عمر کئی کئی انسانی زندگیوں کے برابر ہوجاتی ہے ۔ خود ہمارے ملک میں سیاسی، غیر سیاسی، تعلیمی اور سماجی کام کرنے والے ایسے ادارے ہیں جو اپنی زندگی کی ایک صدی پوری کر چکے ہیں اور اب بھی ان کا مفید کام جاری ہے ۔ قدیم طرز کی مذہبی درسگاہوں

میں دارالعلوم دیوبند کا نام لیا جاسکتا ہے اور جدید مغربی طرز کی کم از کم تین نامور یونیورسٹیاں کلکتہ، بمبئی اور مدراس ایسی ہیں جو اپنی زندگی کی پہلی صدی پوری کر کے دوسری صدی کی پہلی دہائی بھی ختم کر چکی ہیں۔ باہر کی دنیا میں تو ایسی جامعات کی مثالیں موجود ہیں جن کی عمر کئی کئی صدیوں میں شمار ہوتی ہے اور قاہرہ کی جامعۂ ازہر تو اپنی زندگی کے ہزار سال پورے کر کے اس کا جشن بھی منا چکی ہے۔

مگر اداروں اور خاصکر تعلیمی اداروں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ محض ان کی قدامت سے نہیں کیا جانا چاہیئے۔ یہ اندازہ ان کے کردار اور کام ہی سے کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ اسی لئے بعض نسبتاً کم عمر ادارے بھی ایسے پائے جاتے ہیں جن کی سماج کو یا اس فن کو جس کی ترقی کے لئے وہ کام کرتے ہیں دین بہت بڑی ہوتی ہے۔ ہم سب کے لئے یہ امر باعثِ طمانیت ہونا چاہیئے کہ ہماری مادرِ تعلیمی نے اپنی کم عمری میں بھی ملک کے تعلیمی اداروں میں اپنے لئے ممتاز مقام پیدا کیا۔ اب تو پچیس سال اور بیت گئے مگر جب ۱۹۴۶ء میں اسی جگہ جامعہ کا پچیس سالہ جشنِ سیمیں منایا گیا تھا اس وقت بھی جامعہ کی اس خصوصیت کو عام طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔

جامعہ کی بِنا جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک پُر آشوب دور میں پڑی۔ علی گڈھ میں اپنا پنج سالہ عہدِ طفولیت گذارنے کے بعد جامعہ دہلی منتقل ہو گئی کچھ مدت اس نے قرول باغ میں گذاری اور اب تین ۳۵ پینتیس سال سے اوکھلے کی اس تعلیمی بستی میں اس کا قیام ہے۔ جامعہ کی بنیاد جن مقاصد کی تکمیل کے لئے پڑی تھی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم نے جامعہ کا افتتاح کرتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد میں جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے بعد جامعہ کے اور بزرگوں مثلاً مولانا محمد علی مرحوم، حکیم اجمل خاں مرحوم، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم نے وقتاً فوقتاً اس کے مقاصد کی جو تشریح کی اس کے دہرانے کی اس وجہ سے ضرورت نہیں کہ ہم سب ان باتوں سے واقف ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ جامعہ کی اس نصف صدی کی زندگی کو دو تقریباً برابر برابر حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک اس کے آغاز سے لے کر ۱۹۴۶ء کے

جشن سیمیں یا اس کے سال بھر بعد ملک کی آزادی حاصل ہونے تک کا دور اور دوسرا اس کے بعد کا آزادی کے اب تک گذرے ہوئے تقریباً چوبیس سال کا دور۔ جامعہ کے ان دونوں دوروں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ابتدائی پچیس سال کا دور بلا کسی سرکاری امداد کے جس کے دروازے جامعہ نے قصداً اپنے اوپر بند کرلئے تھے جامعہ کے قائم رہنے اور کام کرنے کا دور تھا۔ اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا جس میں ملک کی مرکزی حکومت اور یو، جی، سی کی مالی امداد کے دروازے ملک کے بعض اور قومی اداروں کی طرح جامعہ پر بھی کھل گئے۔

جہاں تک مختلف تعلیمی کاموں کے شعبوں اور ان کے لئے عمارتوں کا تعلق ہے جامعہ کا ابتدائی دور عسرت و تنگی اور ظاہری ساز وسامان کی کمی کا دور تھا۔ اب جامعہ جس دور ثانی سے گذر رہی ہے وہ ایسا دور ہے جس میں مرکزی حکومت سے ملنے والی سرکاری مالی امداد کی وجہ سے وہ پہلی سی عسرت و تنگی اور اتنی مالی دشواریاں باقی نہیں ہیں، مگر اس ابتدائی دور کی جامعہ ہو جو چھوٹی تھی یا جس کے کام کا دائرہ محدود تھا اس وقت بھی جامعہ اینٹ پتھر یا چونے گارے کی عمارتوں کا نام نہ تھا بلکہ اپنے متعین تعلیمی مقاصد کے حصول کے لئے کوشش اور نت نئے تعلیمی تجربوں کا نام تھا اور اب جبکہ جامعہ کی کافی توسیع ہوچکی ہے اس کے شعبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے کئی مستقل انسٹی ٹیوٹ اس میں قائم ہیں اور ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کیٹی کے تازہ فیصلے کے مطابق ایک اور انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز بھی جو ذاکر صاحب کے بیت الحکمت والے خواب کی تعبیر ہوگا جامعہ ہی میں قائم ہونے والا ہے۔ جامعہ کی عمارتوں میں بھی تقریباً ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر موجودہ جامعہ بھی محض شاندار عمارتوں اور اعلیٰ ساز وسامان کا نام نہیں ہے بلکہ انہی بلند تعلیمی مقاصد کو سامنے رکھئے جن کے لئے جامعہ کی بنیاد پڑی تھی، جن کا ذکر جامعہ کے بانیوں نے مختلف مواقع پر کیا تھا اور جن کی عملی تفسیر ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے رفقائے کار نے اپنی زندگی بھر کی کوششوں سے پیش کی تھی انہی مقاصد کو پیش نظر رکھنے اور انہی کی خاطر کام کرتے رہنے کا نام اب بھی جامعہ ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جامعہ ہی کے ایک اجتماع میں جب جامعہ کی عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا ذاکر صاحب مرحوم کی زبانی یہ بلیغ جملہ سنا تھا کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اداروں کی شاندار عمارتیں مقبروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جن میں دور دور تک کہیں زندگی کا نشان نہیں ملتا اور انہی نے یہ اضافہ بھی کیا تھا کہ خدا نہ کرے اور ہمیں اس وقت سے ڈرنا چاہئے جب خدانخواستہ جامعہ ملیہ پر اس قسم کی آفت نازل ہو۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جامعہ اب تک اُس آفت سے محفوظ رہی ہے آیئے ہم سب دعا کریں کہ جامعہ اس آفت سے ہمیشہ محفوظ رہے، اس کی عمارتوں میں نہ صرف زندگی کے آثار ہر وقت موجود رہیں بلکہ ان کے سائے تلے برابر ایسے علمی اور تعلیمی کام انجام پاتے رہیں جو قوموں کو زندگی بخشنے کا باعث ہوا کرتے ہیں۔

موجودہ ہندوستان میں جامعہ کا کردار یا رول کیا ہو یہ مسئلہ بلاشبہ کارکنان جامعہ، جامعہ کے موجودہ طلبا، اور جامعہ کے کام سے دلچسپی اور تعلق رکھنے والوں کی اولین اور گہری توجہ کا مستحق ہے اور یہی ہماری آج کی گفتگو کا موضوع بھی ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ موجودہ دور بڑا مشکل دور ہے صرف ہمارے ملک کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے۔ پورا انسانی سماج ایک عجیب بحران سے گذر رہا ہے۔ نوجوانوں اور خاصکر طلبا میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے والوں کا بیان ہے کہ اس کے محرکات مختلف ملکوں میں مختلف ہو سکتے ہیں اور ہیں بھی مگر جو بات ان میں مشترک ہے وہ یہ کہ موجودہ نظام جہاں کہیں اور جیسا بھی ہے اس سے ان لوگوں کی جو اس نظام میں اپنے آپ کو بندھا ہوا پاتے ہیں تسلی نہیں ہوتی۔ وہ کسی نئی چیز کی اور نئی راہ کی کھوج میں ہیں۔ ان کی بے چینی کبھی کبھی مظاہروں اور بعض اوقات ایسے طریقہائے کار اختیار کرنے میں ہوتی ہے جن کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور افسوس اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں تشدد کے استعمال کی وبا بھی عام ہوتی نظر آتی ہے۔ ہمارے ملک کے تقریباً سبھی تعلیمی ادارے اس بحران سے گذر رہے ہیں اور جامعہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی گو یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ یہاں اس بے چینی کے ویسے مکروہ مظاہرے نہیں ہوتے جیسے اور جگہ دیکھے جاتے ہیں

مگر یہ ظاہری فرق پوری طمانیت کا سبب نہ بننا چاہئے اور کسی بھی مسئلے سے غفلت تو کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہر چند کہ اس قسم کے مسائل جامعہ میں موجود نہ ہوں یا ان کی شدت کا درجہ کم ہو مگر اس کے باوجود ان مسائل پر نظر رکھنا، ان کا جائزہ لینا، ان کے اسباب اور گہرائی کا پتہ لگانا اور ان خرابیوں کے مستقل علاج تلاش کرنا بہت ضروری کام ہے اور ملک کے اور تعلیمی اداروں کو اور جامعہ والوں کو بھی یہ کام کرنا چاہئے۔ جب جگہ جگہ اس قسم کی کوششیں ہوں گی تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ صحیح علاج معلوم کرنے میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہوں اور ہمارے تعلیمی ادارے آج نہیں تو کل ان مسائل کا حل پیش کر سکیں۔ میری رائے میں جامعہ کو اس کام میں جو کسی ایک ادارے کا نہیں بلکہ مستقل قومی مسئلہ ہے اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے۔

بیرونی دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے نظر ہٹا کر جب ہم صرف اپنے ہی ملک پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلا اثر یہ ہوتا ہے خواہ اس کا تسلیم کرنا کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے کہ موجودہ دور دورِ انحطاط دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں معیاروں کی پستی انتہا کو پہنچتی نظر آتی ہے۔ تعلیمی ادارے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں گو اس خرابی کا سہرا اگر اسے سہرا کہنا جائز ہو ان لوگوں کے سر ہے جن کا تعلق سیاسی زندگی سے ہے چونکہ اس طبقے کو حکومت میں دخل ہوتا ہے اور الناس علیٰ دین ملوکھم والی بات اب بھی سچ ہے اس لئے جمہوری دور کے اپنے ان عارضی حکمرانوں کی جو آج ہیں اور کل نہ ہوں گے عام لوگ عادتاً نقل کرتے ہیں اور اپنی بہت سی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے انھیں موردِ الزام قرار دے کر خود اپنے لئے راہِ فرار تلاش کرتے ہیں۔

ان ملکی حالات کے اسباب و وجوہ کا مطالعہ جاری ہے۔ ہمیں اس وسیع میدان پر نظر ڈالنے کی اس وقت مہلت نہیں البتہ تعلیمی اداروں تک اپنے آپ کو محدود رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد تعلیم کی توسیع نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ صدیوں سے دبے ہوئے عوام کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملتے ہی ان کی توقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے بعض اصحاب نظر اسے انقلاب خواہشات Revolution of expectataion بھی کہتے

ہیں ۔ انسان کی خواہشات جب پوری نہیں ہوتیں ۔ ان کے جائز یا ناجائز ہونے کی بحث الگ ہے۔ تو اس میں مایوسی، غصہ، نفرت اور نہ معلوم اور کتنے سفلی جذبات ابھرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ہم اس وقت اپنے ارد گرد افراتفری کا جو عالم پاتے ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہو۔ کم از کم یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ان جذبات کے دخل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک عوام کی خواہشات کا تعلق ہے اس میں ایک بڑی اچھی نیک اور قابل قدر خواہش تعلیم حاصل کرنے کی ہے بلاشبہ یہ خواہش قابل ستائش ہے اور ہندوستانی قوم کی بڑی ہی خوش نصیبی ہوگی کہ ہمارے عوام کی یہ خواہش ملک پوری کر سکے۔ یہ صحیح ہے کہ گذرے ہوئے برسوں میں تعلیمی توسیع تو بہت ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ ہی معیار کی پستی کا احساس بھی عام ہے اور وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ عین ممکن ہے کہ طلبا کی اور نوجوانوں کی بے چینی کی وجہ محض یہ نہ ہو کہ انھیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کام نہیں ملتا اور بیکاری اور بے روزگاری کا شکار ہونا پڑتا ہے بلکہ یہ ہو کہ تعلیم پانے کے بعد وہ حالی مرحوم کے لفظوں میں خود بھی یہ محسوس کرتے ہوں ع

وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

ظاہر ہے کہ اس حالت کو جاری رہنے دینا بڑی خطرناک بات ہوگی۔ یہ بات نہیں ہے کہ ارباب نظر اور ارباب اقتدار کی ان باتوں پر سرے سے نظر نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں کوٹھاری تعلیمی کمیشن ملک کی ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ اور مابعد سندی تعلیم کا جائزہ لے کر اپنی مبسوط رپورٹ پیش کر چکا ہے اس نے بہت سی خرابیوں کے خاصکر تعلیمی معیار کی پستی کو بدلنے کے علاج بھی بتائے ہیں گو یہ کہنا دشوار ہے کہ ان پر عمل ہوگا یا نہیں اور ہوگا تو کب کیونکہ ہمارے ہاں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اکثر وہ کام جو ہونے چاہئیں بالآخر ہوتے ہیں مگر بعد از خرابیٔ بسیار۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ سلسلہ اس معاملے میں بھی جاری نہ رہے۔

مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ کم از کم اس صوبے نے جس سے میرا تعلق ہے یعنی مہاراشٹرہ کی حکومت نے کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کا ایسا نوٹس لیا ہے جیسا لیا جانا چاہیئے۔ مہاراشٹرہ پہلی ریاست

تھی جس نے اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد اسی کی روشنی میں اپنے صوبے کے تعلیمی مسائل پر ایک قرطاس ابیض شائع کیا، غالباً ملک بھر میں اپنے طرز کی پہلی کوشش تھی۔ ابھی یہ دستاویز زیر بحث ہے اور حکومت نے اپنے اس ارادے کا بھی اعلان کیا ہے کہ اس بحث کی روشنی میں ایک تعلیمی قانون مرتب کیا جائے گا جو کم از کم آنے والی چند دہائیوں کے لئے اس صوبے کی حد تک تعلیم کا خاکہ، اس کے حاصل کرنے کے اسباب و ذرائع اور کام کا نقشہ پیش کرے گا۔ ویسے ہمارے ہاں بھی اس کام میں دیر ہو رہی ہے مگر یہ بھی کیا کم غنیمت ہے کہ اس ضرورت کا احساس موجود رہے اور چند قدم ہلکے ہلکے ہی سہی مگر اٹھ تو رہے ہیں کیونکہ تصویر کا دوسرا رخ یہ بتایا جاتا ہے کہ ملک کے بعض اور صوبے ایسے بھی ہیں جنھوں نے کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ سے اتنی دلچسپی نہیں لی ہے جتنی لی جانی چاہیے اور جو شاید یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ماضی کی اور بہت سی سرکاری رپورٹوں کی طرح یہ رپورٹ بھی گلدستۂ طاق نسیاں بن جائے گی اور ممکن ہے کہ دس پندرہ سال بعد پھر از سرِ نو کسی کمیشن کے تقرر کا خیال سامنے آ جائے۔

میں نہیں جانتا کہ جامعہ میں اس رپورٹ پر کتنا غور ہوا اور کم از کم اپنی حد تک جامعہ نے اس کے کن حصوں کو قابل قبول اور نظری اعتبار سے قابل قبول ماننے کے علاوہ قابل عمل قرار دیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کمیشن کی کہی ہوئی ہر بات حرف آخر نہ ہو غالباً کمیشن خود بھی یہ دعویٰ نہیں کرے گا مگر اس نے اپنی محنت و عرق ریزی سے ایک بہت اچھی رپورٹ پیش کر کے غور و فکر کی جو نئی راہیں سجھائی ہیں ان سے مستفید ہونا ہر تعلیمی ادارے کا خاصکر ہماری یونیورسٹیوں کا فرض ہے۔ میرا خیال ہے کہ جامعہ اس کام میں مفید اور قابل قدر امداد دے سکتی ہے کیونکہ جامعہ کی تعلیمی بستی میں خواہ وہ چھوٹی ہی سہی اور تعداد کے لحاظ سے کسی بھی تعلیمی بستی کا چھوٹا ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ اس دور میں بڑی خوبی ہے، بیک وقت ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ مختلف ایسے شعبے ہیں جن میں مخصوص علوم و فنون کی تعلیم پر خاص توجہ کی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ استادوں کی ٹریننگ کا بھی انتظام موجود ہے جو کسی بھی تعلیمی نظام اور تجربے کے لئے سب سے زیادہ اہم کام کہا جا سکتا ہے۔

جامعہ نے اپنے ابتدائی دور یا اپنی اب تک کی زندگی کے نصف اول میں مختلف تعلیمی تجربے کئے ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں اور ثانوی تعلیم میں بھی۔ یہ کام اس دوسرے دور میں بھی جاری رہنا چاہئے بلکہ اس کی رفتار میں تیزی پیدا کرنا ممکن ہو تو وہ تیزی بھی پیدا کرنی چاہئے۔ ویسے تو یہ کام ملک کی سبھی جامعات کو کرنا چاہئے لیکن جامعہ کا جو ماضی رہا ہے اس کی روایات میں یہ چیز شامل ہے۔ اپنی اس دیرینہ روایت کو قائم رکھ کر جامعہ خود اپنے لئے اور ملک کے اور تعلیمی اداروں کے لئے اس باب میں مفید بن سکتی ہے۔

بات کچھ طویل ہو رہی ہے پھر بھی چند الفاظ جامعہ کے نام ہی میں ملیہ کے ساتھ جو اسلامیہ کا جز ہے اس کی بابت بھی عرض کرنا ضروری ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ موجودہ حالات میں بعض ذہنوں میں یہ شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ کیا جدید ہندوستان میں جامعہ کا یہ کیریکٹر یعنی اسکا اسلامیہ ہونا باقی رہ سکتا ہے؟ ممکن ہے یہ شبہات اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے ہوں کہ ملک کے دو اور مرکزی اور نامور تعلیمی اداروں کے نام میں سے لفظ مسلم اور ہندو حذف کرنے کا خیال سامنے آچکا ہے گو اسے عام تائید حاصل نہیں ہوئی ہے نہ اس کے امکانات نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے نام پر زیادہ بحث اس لئے بھی ہوتی ہو کہ کام پر بحث کرنے کو جی نہ چاہتا ہو اور ارادتاً نام کی بحث کو اتنا طویل کر دیا جاتا ہو کہ کام پر بحث کا موقع ہی نہ آئے۔ بہر حال جو شکوک و شبہات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں انھیں یکسر بلا وجہ نہیں کہا جا سکتا اور جب اس قسم کے شبہات پیدا ہوں تو ان کی بابت کم از کم اپنے ذہن کی صفائی کر لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس باب میں میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق جو تاریخی بات بہت واضح طریقے سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے رام گڈھ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کہی تھی وہ ہندوستانی مسلمانوں کو عام طور پر اور جامعہ جیسے تعلیمی اداروں کو خاص طور پر ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے۔ ہندوستانی مسلمان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ہندوستانی ہونے کے ساتھ اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کرے اور ان دونوں حیثیتوں میں کسی باہمی تضاد کو تسلیم نہ کرے تو اسے یہ بات بھی صاف

طریقہ سے کہہ دینی چاہئے کہ جامعہ اگر ملیہ ہے تو اس کے ساتھ اسلامیہ بھی ہے اور رہے گی اس کے ملی کیریکٹر کے ساتھ اس کا اسلامی کیریکٹر بھی ایک تاریخی اور زندہ حقیقت ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا نہ نظر انداز کئے جانے کی اجازت دی جاسکتی ہے البتہ یہ کیریکٹر ویسا نہیں ہوسکتا جیسا سیاسی ضرورتیں رکھنے والے یا الیکشن ضرورتوں کے مارے ہوئے اصحاب تصور کرتے ہیں بلکہ یہ وہ اسلامی کیریکٹر رہا ہے اور رہے گا جس کا ہندوستان کی ایکتا اور قومیت کے جذبے سے کسی طرح ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے میں ملا کر وہ ایک ایسی خوشنما اور حسین تصویر پیش کرتا ہے جو آزاد جمہوری اور سیکولر ہندوستان کے جاذب نظر نقشے میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے اور اسے اپنی جگہ سے ہٹانے کی کوشش غلط ہوگی اور اس پورے نقشے کے حسن کو بگاڑ دے گی۔ خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو اور اگر کبھی اس کا خطرہ ہو تو ہر صاحب نظر ہندوستانی کو بلا لحاظ مذہب و ملت اس کے سدباب کی کوشش کرنی چاہئے۔

جامعہ جیسے ادارے کو قوم سے اپنا براہ راست تعلق صرف ان نوجوانوں کی تعلیم کے ذریعہ نہیں جو اس مقصد کے لئے یہاں آتے ہیں ملک کے اور حصوں میں تعلیمی کام کرنے والے اور عام طور پر تعلیمی مسائل اور جامعہ کے تعلیمی تجربات سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس قسم کا تعلق کسی بھی ادارے کے لئے بڑی تقویت کا باعث ہوسکتا ہے۔ ماضی میں جامعہ نے اس کی ضرورت برابر محسوس کی اور جب تک ہمارے شفیق ساتھی شفیق الرحمان قدوائی مرحوم جامعہ میں رہے اس کام میں ان کی خصوصی توجہ سے بہت اچھے نتائج پیدا ہوتے رہے۔ بدقسمتی سے ان کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ میری رائے میں اگر اس سلسلے کو پھر شروع کیا جاسکے اور جگہ جگہ ہمدردان جامعہ کے حلقے قائم کئے جاسکیں تو یہ مفید کام ہوگا۔ اس سلسلے میں طلبائے قدیم سے قدیم قابل قدر امداد حاصل کی جاسکتی ہے بشرطیکہ پہلے انجمن طلبائے قدیم کا نظام درست کرلیا جائے۔

کسی بھی نظام کے لئے مالی ذرائع نظر انداز نہیں کئے جاسکتے اس سلسلے میں جی چاہتا ہے کہ ایک عملی تجویز آپ کے سامنے پیش کروں جو اسی جشن زریں کے سلسلے میں مسلمانوں میں سماجی فلاح

کے کاموں کے مسائل پر غور کرنے کے لئے جو سیمینار ہوا اس میں ملک کے نامور ماہر معاشیات اور دہلی یونیورسٹی کے اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر نے ہارورڈ یونیورسٹی کی جو روایت بتائی اسے ہم اپنے لئے قابل تقلید بنا سکتے ہیں۔ پروفیسر خسرو نے بتایا کہ ہارورڈ یونیورسٹی نے اپنے ہاں یہ روایت قائم کی ہے کہ اس کے فارغ التحصیل طلبا جب اپنی مادر تعلیمی سے رخصت ہونے لگتے ہیں تو یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس کے بعد پچیسویں سال میں وہ اپنی اس وقت جو آمدنی ہو اس میں سے ایک ماہ کی آمدنی اس ادارے کی نذر کریں گے۔ اس روایت کا عملی روپ یہ ہو گیا ہے کہ ہر سال سابق طلبائے ہارورڈ کی ایک بڑی تعداد اپنی اس سال کی آمدنی کا بارھواں حصہ اس وعدے کے مطابق ہارورڈ کو پیش کرتا ہے اور امریکہ میں دولت مندی کا اور اس ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی آمدنی کا جو معیار ہے اس کے مطابق ہارورڈ کو ہر سال ایک خطیر آمدنی ہوتی ہے جو اس کے تعلیمی کاموں کے مصارف پورے کرنے میں کام آتی ہے کیوں نہ ایسا ہو کہ انجمن طلبائے قدیم اس مسئلے پر غور کر کے کوئی ٹھوس تجویز سابق طلبائے جامعہ کے سامنے رکھے کہ جامعہ سے علیحدگی کے بعد ایک مقررہ مدت جو ضروری نہیں کہ پچیس سال ہی ہو دس یا پندرہ سال بھی مقرر کی جا سکتی ہے اپنی اس وقت کی سال بھر کی آمدنی میں سے ایک مقررہ حصہ انجمن کو دیں تاکہ وہ اس روپیہ کو جامعہ کے تعلیمی کاموں میں سے کسی مناسب مد پر خرچ کر سکے اور اس طرح ایک طرف سابق طلبا کا اپنی مادر تعلیمی کے ساتھ تعلق اور رابطہ بھی باقی رہے اور انجمن اور انجمن کے توسط سے جامعہ کے لئے ہر سال آمدنی کا ذریعہ بن سکے۔

اس کے باوجود اور کاموں کے لئے سرکاری امداد پانے کے جامعہ کی تعلیمی بستی میں متعدد ایسے کام ہیں اور ہمیشہ ہو سکتے ہیں جن کے لئے اور ذرائع سے مالی امداد حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے طلبائے قدیم اگر اس کام میں پہل کریں اور کوئی مناسب تجویز سوچ کر اسے نافذ کر سکیں تو یہ جامعہ کے اس جشن زریں کی ایک عمدہ یادگار بن سکے گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس تجویز پر غور کریں گے اور اگر اسے قابل قبول مان لیں تو ایک اور نیک کام کی ابتدا ہو سکے گی۔

حضرات! ویسے یہ موضوع کافی وسیع ہے اور اس کے اور گوشے اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں

مگر میں ان چند اشارات پر جو میں نے اب تک کئے ہیں اکتفا کروں گا کیونکہ وقت کی قید ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اور اصحاب اسی موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے والے ہیں۔

قبل اس کے کہ آپ سے اجازت چاہوں انجمن طلبائے قدیم کو دو ایک ضروری کاموں پر توجہ دلانے کی جرات کروں گا۔ آپ سب واقف ہیں کہ ہماری انجمن کا نظام کچھ بہت جاندار نہیں ہے۔ جوبلی کے موقع پر جمع ہونا اچھا ہے مگر یہ اور بات ہے، جامعہ جیسے ادارے کے طلبائے قدیم کے نظام کو درست کرنے پر ہمیں توجہ کرنی چاہیئے اس کی ممبری ـــ اس کی جو بھی شرائط ہوں اس کے مطابق اور اس دائرے میں رہ کر کافی بڑھ سکتی ہے وہ بڑھانی چاہیئے۔ کم از کم جامعہ کے گریجوائٹ جن کی تعداد اب ماضی کی طرح محدود نہیں بلکہ سینکڑوں سے گذر کر ہزاروں کی ہوگی انہیں ممبری پر آمادہ کرنا چاہیئے اور جامعہ کی اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ اس بستی میں طلبائے قدیم کے اپنے مسکن یا اولڈ بوائز لاج کا بھی انتظام کرنا چاہیئے۔

آخر میں ایک اور بات پر جس میں میرے علم کے مطابق جامعہ کے طلبائے قدیم کی کوششوں کو کافی دخل ہے اظہار مسرت کرنا ہے وہ جامعہ کی تعلیمی بستی میں مسجد کی تعمیر ہے۔ گو اس کام میں کافی دیر ہوئی ہے مگر یہ منظر کیا کم خوش کن ہے کہ جامعہ کی بستی کی شایان شان مسجد کی تعمیر کا جو خواب ہم نے جشن سیمیں کے موقع پر دیکھا تھا وہ اب پچیس سال بعد ہی سہی شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے اور ذاکر صاحب مرحوم کی آخری آرام گاہ کے قریب یہ اللہ کا گھر تعمیر ہو رہا ہے۔ وہ دن ہم سب کے لئے بڑی خوشی اور بے پایاں مسرت کا دن ہوگا جب یہ تعمیر مکمل ہوگی اور ہم اس مسجد میں اس کی تعمیر کی تکمیل پر دوگانہ شکر ادا کر سکیں گے۔

حضرات میں نے آپ کا بہت زیادہ وقت لے لیا۔ سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور خاتمہ کلام اس بات پر کرتا ہوں کہ جب جامعہ کے جشن سیمیں میں شریک ہوا تھا تو بمبئی سے جو احباب تشریف لائے تھے ان میں سے ایک صاحب نے کہا تھا کہ اگر زندہ رہے تو جامعہ کے جشن زریں میں شرکت کریں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ سعادت نصیب ہوئی۔ اب ہم میں

سے اس دور کے طلبائے قدیم عمر کی جن منزلوں میں ہیں ان میں یہ خواہش کہ زندگی نے وفا کی تو اب سے پچیس سال بعد پھر جامعہ کی جوبلی میں شریک ہوں گے اچھی خواہش تو کہلا سکتی ہے مگر بہت زیادہ جینے کی ہوس یا حرص کے لحاظ سے شاید یہ جائز خواہش نہ کہلا سکے۔ جوبلیاں منانے والوں کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ جشن زریں کے دس سال بعد جب ادارے کی عمر پورے ساٹھ سال کی ہو جائے تو وہ ڈائمنڈ جوبلی منایا کرتے ہیں۔ دس سال کوئی طویل مدت نہیں ہے۔ اللہ کے فضل اور آپ سب کی دعاؤں سے قویٰ بھی ابھی کام کاج کے قابل ہیں مگر زندگی اور موت جس کے قبضے میں اور صرف جس کی اپنی ذات حی ولایموت ہے اس نے اگر زندہ رہنے کی مہلت دی اور جامعہ نے دس سال بعد اپنا جشن پھر منایا تو عین ممکن ہے کہ اس میں بھی حاضری دے سکوں۔ میری گذارشات آپ کے صبر و سکون سے سننے کا پھر ایک بار شکریہ۔ خدا حافظ۔

"میں جامعہ کے باہر ایک عہدے کو قبول کر سکا اس اطمینان کے ساتھ کہ جامعہ کے سب کام بدستور چلتے رہیں گے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ جامعہ کے سب کام چلتے رہے ہیں اور اس سے زیادہ حوصلہ افزا یہ بات ہے کہ قومی ضرورت کا وہ احساس جس کی بدولت جامعہ قائم ہوئی تھی، اب بھی اسی طرح کارفرما ہے۔۔۔۔ ہم نے جامعہ میں پہلے دن سے جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس میں پہلی شرط کام کی لگن ہے، کام کی لگن کے ساتھ صبر بھی جامعہ والوں کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ آپ اس کا بالکل خیال نہ کریں کہ جامعہ کے کام ملکی زندگی کے پھیلاؤ کے ساتھ نہیں پھیلے، جامعہ کی آبادی ملک کی آبادی کے ساتھ نہیں بڑھی، کم کم دینا، دیر دیر سے دینا بھی خدا کی ایک مصلحت ہے، جس کا راز سمجھنا پورا آدمی بننے اور پورے آدمی کا کام کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔"

(خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین

انور صدیقی

علم و دانش کا چراغ ـــــ برٹرنڈ رسل

برٹرنڈ رسل نے ہر معیار سے انتہائی بھرپور اور متنوع زندگی گزاری۔ اس تنوع اور ہمہ جہتی نے اسے فکرِ جدید کے معماروں کی صف میں ممتاز اور نمایاں جگہ دی' ایک ایسی ممتاز جگہ جہاں کم لوگ اس کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی جسارت یا جراُت کر سکتے ہیں۔ اس کی ذہنی دسترس پر غور کیجئے تو حیرت بھی ہوتی ہے اور حسرت بھی۔ حیرت اس بات پر کہ بیسویں صدی میں علوم اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہو چکے ہیں کہ بالعموم اختصاصی مہارت کے لوگ ہی اُن پر قادر ہو سکتے ہیں اور حسرت یوں کہ اس دور میں ہم اس ہمہ جہتی اور ذہنی دسترس کے صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے علوم انسان کی دسترس میں تھے اور اب انسان علوم کی دسترس میں ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے انسان کے ذہنی قد کو بہت چھوٹا کر دیا ہے۔ رسل کے کارنامے یا ذہنی فتوحات ہمیں تھوڑی دیر کے لئے اس المیہ احساس سے نجات دلاتی ہیں۔ اس کی یہی دین کیا کم ہے!

اس مختصر سے مضمون میں ہم رسل کی زندگی اور اس کے کارناموں کا جائزہ لیں گے مگر یہ کام بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ تمام علوم پر قادر ہونا یا عبور حاصل کرنا۔ اس لئے ہم چاہیں گے کہ آپ ان سطروں کو سعئ ناکام نہیں تو سعئ ناتمام کی حیثیت سے پڑھیں۔ خود رسل کی شخصیت میں اتنے رنگ اور اتنے نقش ہیں کہ ان کو لفظوں کی گرفت میں لانا انتہائی مشکل کام ہے۔ رسل نے اپنی ذہنی زندگی کے ادوار یوں متعین کئے ہیں:

"جب میں ریاضی میں بودا ثابت ہوا تو میں نے فلسفے کو اپنایا اور جب

فلسفے میں یہی احساس ہوا تو میں نے تاریخ کی طرف توجہ کی۔"

یہ امر واقعہ ہے کہ اس نے گیارہ سال کی عمر سے ۳۸ سال کی عمر تک ریاضی میں دلچسپی لی اور اس کی فلسفیانہ اور منطقی بنیادوں کی تلاش میں لگا رہا۔ ساٹھ سال کی عمر کے بعد اس نے اس موضوع سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ اس کے بعد اس نے فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، نفسیات اور تعلیم و اخلاق کو اپنے فکر و نظر کا محور بنایا اور بہت سی ایسی باتیں لکھیں یا بہت سے ایسے ذہنی رویے اختیار کئے جو غیر روایتی ہونے کی وجہ سے چونکا دینے والے تھے بالخصوص مذہب و اخلاق کے سلسلے میں اس کے نظریات بحث و نظر کا موضوع بنے۔ ان ذہنی مجادلوں یا محاربوں میں رسل کی رسوائی بھی ہوئی اور شہرت بھی۔ برطانیہ کا روایت پرست سماج اس کے افکار کی تاب نہ لا سکا۔ اسے غیر تقلیدی رویوں کی وجہ سے قید و بند کی صعوبتوں سے لیکر ذہنی تنہائی کی ان تمام منزلوں سے گزرنا پڑا جو ازل سے ارباب نظر کا مقدر رہیں۔

کسی کا قول ہے کہ انسان بچپن میں جن چیزوں کو کھو دیتا ہے انھیں کی تلاش سے اس کی باقی عمر عبارت ہوتی ہے۔ رسل کا بچپن بھی اس اعتبار سے بہت اہم ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان میں ۱۸ مئی ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوا جو برطانوی خاندانوں میں خاصا ممتاز تھا۔ یہ خاندان شروع سے ہی امارت اور سیاسی اثر و رسوخ کے لئے مشہور تھا۔ اس کے باپ کا نام امبرلی تھا اور وہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھا۔ اس کے خاندان کے ایک بزرگ ولیم لارڈ رسل کو چارلس دوم کی مخالفت میں سزائے موت دی گئی تھی۔ رسل خاندان کا ہر ایک فرد ولیم لارڈ رسل کو اپنا ہیرو سمجھتا تھا۔ بچپن میں ہی یہ بات رسل کے ذہن میں بٹھا دی گئی تھی کہ عوام کی خدمت رسل خاندان کی دیرینہ روایت ہے اور یہ کہ کبھی کبھی بغاوت کا علم بلند کرنا بھی جائز ہے۔ رسل ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے اٹھارہ ماہ بعد اس کا باپ بھی چل بسا۔ رسل اور خاندان کے دوسرے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی دادی نے سنبھال لی۔ ان خاتون کو لوگ لیڈی جان کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ اپنے نظریات میں پیورٹن ہونے کے باوجود خوش طبعی اور زندہ دلی کو پسند کرتی تھیں۔

ویسے وہ اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے قدامت پسندوں کے حلقے میں خاصی بدنام تھیں۔ انہوں نے آئرستانی تحریک آزادی کی حمایت کی اور برطانیہ کی سامراجی جنگوں کی مخالفت۔ اس طرح رسل اور اس کے بھائی فرینک کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس میں قدیم پیوریٹن عقائد اور حریت فکر کے نظریات کا امتزاج تھا۔ خاندان کے ہر فرد کے لئے گرجا جانا لازمی تھا۔ چنانچہ رسل اپنی دادی کے ساتھ برابر ان مذہبی تقریبات یا عباداتی سرگرمیوں میں شریک ہوتا۔ ان سرگرمیوں کا اثر یہ ہوا کہ اس کے معصوم ذہن میں گناہ اور گنہ گاری کی دہشت بیٹھ گئی۔ وہ شام کو تنہا چہل قدمی کرتا تو اس کا احساس گناہ کی گراں باری محسوس کرتا۔ گھر میں اس کی عمر کا کوئی اور بچہ نہ تھا اس احساس نے اسے اور بھی خلوت پسند اور شرمیلا بنا دیا۔ اپنے احساس کی خلوت کو وہ ہمہ وقت بہت سے افکار سے آباد رکھتا۔ مسلّمہ عقائد سے اس کے انکار یا عدم اعتماد کی پہلی مثال ہمارے سامنے اس وقت آتی ہے جب رسل صرف پانچ سال کا تھا۔ اسے جب یہ بتایا گیا کہ زمین گول ہے تو اس نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اس بات کی تحقیق کے لئے اُس نے زمین میں ایک گڑھا کھودنا شروع کر دیا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اگر زمین گول ہے تو وہ آسٹریلیا میں نکلے گا۔ خیر، یہ تو ایک طفلانہ سی کوشش تھی مگر اس سے رسل کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تقریباً اسی عمر میں کسی نے بتایا کہ جب ہم سو جاتے ہیں تو فرشتے ہمارے سرہانے پہرہ دیتے ہیں۔ رسل نے جواب دیا کہ مجھے تو فرشتے کبھی نہیں دکھائی دئے۔ اس پر اسے یہ بتایا گیا کہ وہ جس لمحے آنکھیں کھولتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں اس نے سوچا کہ اس کی بھی تحقیق کی جائے چنانچہ اس نے ایک ترکیب سوچی وہ آنکھ بند کر کے لیٹ گیا کچھ دیر بعد اس نے سرہانے آنکھ بند کر کے ٹٹولنا شروع کیا مگر اسے کوئی فرشتہ ہاتھ نہ آیا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی اور وہ اس عقیدے کو بھی توہّم سمجھنے لگا۔ گیارہ سال کی عمر میں اس کے بڑے بھائی فرینک نے اسے اقلیدس پڑھانی شروع کی۔ رسل کو یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوئی کہ یہاں بھی ایسی چیزوں کو مان کر چلنا پڑتا ہے جنھیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح گیارہ سال کی عمر میں ریاضی کی منطقی بنیادوں کے سلسلے میں وہ شکوک پیدا ہو گئے

جواس کی شہرۂ آفاق تصنیف اصول ریاضی (Principia Mathematica) کی تصنیف تک اس کے ذہن پر مستولی رہے۔

بچپن میں ہی اسے ریاضی کے علاوہ تاریخ اور ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے جب مشہور رومانی شاعر شیلی کا کلام پڑھا تو اس پر حیرت و مسرت کے جذبات طاری ہو گئے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس نے جب پہلی بار شیلی کے ابتدائی دور کی نظم الستور پڑھی تو اسے ایسا لگا جیسے دنیا سے اس کا ساتھ بچھڑ گیا ہو اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے دادا کی لائبریری کی بعض کتابیں نہ پڑھے۔ اس پر اس کا الٹا اثر ہوا اور اس نے چن چن کر ایسی کتابیں پڑھ ڈالیں جن کے مطالعے سے باز رہنے کی اسے ہدایت کی گئی تھی۔ اس طرح رسل نے بچپن میں ہی اتنا کچھ پڑھ لیا تھا جو دوسروں کے لئے عمر بھر بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہت سے مذہبی عقائد کے سلسلے میں بھی اس نے اپنے شبہات راز داری کے خیال سے اور گھر والوں کی مخالفت کے ڈر سے یونانی رسم الخط میں ایک ڈائری کی شکل میں لکھ لئے تھے اور یہ طے کر لیا تھا کہ وہ انھیں باتوں کو قبول کرے گا جو اسے ذہنی طور پر مطمئن کر سکیں گی۔ اس نے پہلے ذاتی ابدیت کے عقیدے سے انکار کیا۔ بہت دنوں تک اس نے اٹھارویں صدی کے Deists (خدا پرستوں) کے ان دلائل کو قابل قبول سمجھا جو انھوں نے خدا کے وجود کے سلسلے میں دئے تھے اس نظریے کو 'سبب اولیٰ' (First Cause) کے نظریے سے یاد کیا جاتا ہے۔ جان اسٹوارٹ مل کے مطالعہ کے بعد اس نے اس نظریے کو بھی ترک کر دیا اور سرے سے ہی خدا کا منکر ہو گیا۔ مل، رسل کے والد کا قریبی دوست تھا اس نے رسل کے تشکیل پذیر ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مل نے انیسویں صدی کے برطانوی تجربی فلسفے کی تشریح کی تھی جس کے مطابق ہمارا تمام تر علم تجربے کی دین ہے۔

کیمبرج میں داخلے کے لئے ضروری تھا کہ وہ لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی دستگاہ حاصل کرے۔ چنانچہ اسے ایک ایسے اسکول میں داخل کرایا گیا جس میں ان لڑکوں کو تعلیم دی جاتی تھی جو آئندہ فوجی ملازمت کی خاطر سینڈہرسٹ میں داخلہ لیتے۔ غالباً رسل کو اس کی دادی نے اس اسکول

میں اس وجہ سے داخل کرایا کہ انھیں انگلستان کے پبلک اسکولوں سے نفرت تھی۔ رسل نے اس اسکول میں اٹھارہ مہینے گزارے اور اس مدت میں اس نے کلاسیکی زبان و ادب کا اتنا مطالعہ کرلیا جتنا ایک اوسط درجے کا طالب علم کم ازکم چھ سال میں کرتا ہے۔

رسل کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں ۱۸۹۰ء میں اس وقت داخل ہوا جب اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ وہ یہاں آیا تو اسے کچھ یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک نئی دنیا میں آ گیا ہو جو بہت سے غیرمرئی امکانات سے معمور ہو۔ خود اس کے کالج میں بہت سے ممتاز فلسفی اور طالب علم تھے۔ رسل نے شروع سے ہی ایسے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا جو اپنے اندر کسی نہ کسی طرح کی انفرادیت کے جوہر رکھتے تھے، اس نے سب سے پہلی دوستی اے، این وہایٹ ہیڈ سے کی جو اس کے وظیفے کے امتحان کا ممتحن تھا اور جو اس سے دس سال پہلے کیمبرج میں داخل ہوا تھا اور اب فیلو تھا۔ وہ رسل کے امتحان کے جوابات سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے سینئر طالب علموں سے کہنا شروع کیا کہ وہ رسل سے ملیں۔ یہیں اس کی ملاقات مور سے ہوئی اور یہیں اُسے میک ٹیگرٹ کے ذہنی کمالات سے آگاہی ہوئی۔ مور کیمبرج میں کلاسیکی زبان و ادب کے مطالعہ کے لئے آیا تھا اور چاہتا تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی اسکول میں مدرّسی کا پیشہ اختیار کرے۔ رسل اس کی فطانت سے متاثر تھا اور چاہتا تھا کہ وہ زبان و ادب سے ہٹ کر فلسفے کی طرف توجہ کرے۔ چنانچہ ایک دن میک ٹیگرٹ کو اس خیال سے چائے پر مدعو کیا کہ وہ مور سے اس کی ملاقات کرا سکے۔ اس ملاقات میں میک ٹیگرٹ نے جب یہ نظریہ پیش کیا کہ زمان بے اصل ہے، مور نے اس نظریے کو مہمل قرار دیتے ہوئے جو دلائل پیش کئے اُن سے رسل کو اس کی استدلالی حیثیت کا اندازہ ہوا اور رسل مور کو زبان و ادب سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد فلسفے کے میدان میں مور نے جس دراکی کا ثبوت دیا اس سے رسل بے حد متاثر ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رسل نے مور سے کافی استفادہ کیا۔

طالب علمی کے زمانے میں رسل کی سرکش عقلیت میں پیورٹن تربیت کی خشونت اور خشکی تھی۔ ویسے کیمبرج میں ہی اسے اپنی شخصیت میں اس عنصر کی ناخوشگوار موجودگی کا احساس ہوا اور اس

نے طے کرلیا کہ وہ روز کوئی نہ کوئی نازیبا یا ناخوشگوار حرکت ضرور کیا کرے گا تاکہ یہ عنصر اس کی شخصیت سے خارج ہو سکے۔ اس فیصلے کے باوجود اس زمانے میں وہ جنس کے متعلق وہی پرانے خیالات رکھتا تھا۔ انھیں خیالات کا اثر تھا کہ اس نے ایک بار ایک ایسی لڑکی کو تنبیہ کی جو ایک ایسے لڑکے سے عشق لڑا رہی تھی جس سے اسے قطعاً محبت نہیں تھی۔ چونکہ اس کا بچپن تنہائی کے عالم میں گزرا تھا اس وجہ سے اسے دوسری جنس کو جاننے یا سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ایسا آدمی بالعموم عورت کو پہلی ملاقات میں ہی دل دے بیٹھتا ہے۔ رسل کے ساتھ بھی یہی ہوا وہ ایلس پیرسل اسمتھ پر عاشق ہو گیا اور ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو اس سے شادی کرلی۔ ایلس، رسل سے پانچ سال بڑی تھی۔ یہ رسل کی پہلی شادی تھی۔

سیاست سے دلچسپی رسل خاندان کا مزاج تھی۔ اس زمانے میں انگلستان میں فے بین سوسائٹی کا شہرہ تھا۔ یہ سوسائٹی سوشلزم کے اصولوں کو آئینی طریقوں سے نافذ کرنے کے حق میں تھی۔ برطانیہ کے بہت سے دانشور اس کے رکن تھے۔ اپنے سالے لوگن پیرسل اسمتھ کی وساطت سے وہ اس سوسائٹی کے کئی ارکان سے قریب ہوا۔ رسل نے سوشلزم کے مطالعے کی غرض سے اپنی بیوی کے ساتھ جرمنی کا دوبار دورہ کیا جہاں اسے جرمن عسکریت اور مارکسی اشتراکیت کے براہ راست مطالعے کا موقعہ ملا۔ جرمنی کے سوشلسٹوں نے انقلاب لانے کی خاطر جو ذرائع استعمال کرنے شروع کئے تھے، رسل ان سے نہ صرف یہ کہ غیر مطمئن ہوا بلکہ بیزار بھی ہو گیا۔ انگلستان واپس آکر اس نے فے بین سوسائٹی کے جلسے میں جب اپنے بے لاگ تاثرات بیان کئے تو اس انجمن کے بہت سے افراد اس سے برگشتہ ہو گئے۔

۱۸۹۶ء میں رسل چند مہینوں کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ امریکہ گیا۔ وہاں اس نے دو یونیورسٹیوں میں "اقلیدس کی بنیادوں" پر لکچر دیئے۔ واپسی پر وہ سسکس کے مقام پر ایک چھوٹے سے مکان میں سکونت پذیر ہو گیا اور ریاضیاتی فلسفے پر کام شروع کر دیا۔ یہ کام انتہائی مشکل اور صبر آزما تھا۔ اس کام پر لگنے سے پہلے رسل کو بہت سے فلسفوں کا جائزہ لینا تھا کچھ کو ترک کرنا تھا اور کچھ کو

اختیار۔ اس نے کانٹ اور ہیگل کے فلسفوں کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ انھوں نے بیکرانی یالامحدود Infinity کے متعلق جو موشگافیاں کی تھیں ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ثابت کرسکیں کہ عالم اسباب غیر حقیقی ہے۔ جرمنی میں اپنے قیام کے دوران اس نے ویرزٹراس اور سنٹور کے بارے میں پڑھا اور ان کی تحریریں دیکھیں۔ اول الذکر نے ثابت کیا تھا کہ Calculus 'لامحدود' کے تصور پر منحصر نہیں ہے موخرالذکر کا نظریۂ لامحدود بلاشبہ کچھ عجیب تھا مگر تھا تضادات سے پاک۔ اسی زمانے میں رسل نے کیمبرج میں لائبنز کے فلسفے پر لکچر دیا جو بعد میں Philosophy of Leibnitz کے عنوان سے شائع ہوا۔ اپنی تمام تر تجزیاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر رسل نے لائبنز کے فلسفے کی بالکل نئی توجیہہ وتفسیر کی۔ اس مطالعہ کے دوران اس نے صغریٰ وکبریٰ والی منطق سے بھی انکار کیا اس طرح اس نے بریڈلے کے فلسفے کی بھی تردید کر دی۔ ترک واختیار کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد اس نے اپنی کتاب 'اصول ریاضی' کا خاکہ مرتب کیا۔ اس کتاب کی تصنیف میں اے، این وہائٹ ہیڈ بھی شامل تھا۔ دونوں نے کتاب کے مختلف حصے آپس میں بانٹ لئے۔ ان میں میں سے جب کوئی ایک باب لکھ لیتا تو دوسرے کے پاس بھیج دیتا۔ اس طرح ایک دوسرے کی رایوں کی روشنی میں ترمیم واضافے کا عمل بھی چلتا رہتا۔ اس زمانے میں وہ سال کے چند مہینے کیمبرج میں گزارتا جہاں وہ مل کر بہت سے مسائل پر آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ اس ذہنی رفاقت کی وجہ سے اس صدی کی ایک اہم تصنیف مکمل ہوئی جو بوجوہ ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آسکی۔ یہ تصنیف کچھ اس قدر مشکل موضوع پر ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں شاید ہی بیس افراد نے اس کا پوری طرح مطالعہ کیا ہوگا۔ ایک نقاد نے تو از راہ مذاق یہاں تک کہہ دیا ہے کہ شاید رسل اور وہائٹ ہیڈ نے بھی اسے نہ پڑھا ہو۔ کچھ بھی ہو اس کتاب کو کلاسیکی مرتبہ حاصل ہوا لیکن کلاسیکی کارنامے کی بدنصیبی بھی اس کے ساتھ لگ گئی۔ کلاسیکی کارناموں پر لوگ گفتگو زیادہ کرتے ہیں، پڑھتے کم ہیں۔ رسل کا یہ کارنامہ کم اہم نہیں ہے کہ اس نے ریاضی کو فلسفیانہ اور منطقی بنیادیں فراہم کردیں اس طرح اس نے علم ریاضی کو اس کی پراسراریت سے محروم کر دیا۔

اپنی تمام تر عقلیت پسندی کے باوجود رسل متصوفانہ حقائق سے انکار نہ کر سکا اگرچہ ان تمام لوگوں کو اپنا ہدف بنایا جو عقل سے انکار کی خاطر جذبے یا وجدان کی برتری کا علم بلند کرتے ہیں۔ چونکہ وہ خود زبردست عقلیت پسند تھا اس وجہ سے اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ عقل کی مدد سے متصوفین کے نظریات کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ در اصل یہ ہے کہ وہ خود کبھی کبھی زندگی کے بعض لمحوں میں اس کیفیت سے دوچار ہو جاتا تھا جن کا صوفیا تذکرہ کرتے ہیں اس نے اپنی کتاب منطق اور تصوّف (Mysticism and Logic) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ عظیم لوگ جو فلسفی رہے ہیں انھیں سائنس اور تصوّف دونوں ہی کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

۱۹۰۷ء میں رسل نے پارلیمنٹ کے لئے الکشن لڑا اور ناکام رہا۔ ۱۹۱۰ء میں اصول ریاضی ختم کر چکا تو اس نے سنجیدگی سے الکشن لڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اس بار وہ لبرل پارٹی کے باقاعدہ امیدوار کی حیثیت سے سامنے آنا چاہتا تھا۔ اس کی امیدواری کا مسئلہ تقریباً طے ہو چکا تھا کہ ایک مشکل پیش آئی۔ اس کے حلقۂ انتخاب کی پارٹی کی شاخ کے ممبروں کو معلوم ہو گیا کہ وہ ملحد ہے اور انھوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ جب رسل نے یہ اعلان کیا کہ وہ دنیا کو دکھانے کی خاطر گرجا گھر نہیں جا سکتا تو اس کی امیدواری کا مسئلہ حل ہو گیا اور وہ اس طرح کہ اس کے بجائے ایک دوسرے شخص کو پارٹی نے امیدوار منتخب کیا اور وہ کامیاب ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۱۰ء میں رسل کا تقرر ٹرینٹی کالج، کیمبرج میں منطق اور اصول ریاضی کے شعبے میں ہو گیا۔ یہاں آتے ہی رسل نے اپنے غیر روایتی اور انقلابی خیالات کا برملا اور بے محابا اظہار شروع کر دیا۔ بعض افراد کے سلسلے میں اس نے ایسی باتیں کہیں کہ لوگ اس سے برگشتہ ہو گئے بالخصوص مشہور ماہر معاشیات کینز (Keynes) سے اس کی ٹھن گئی اور وہ ایک دوسرے پر طنز کے تیر برسانے لگے۔ رسل نے کینز کو میکاولیت کا علمبردار ٹھہرایا اور اس کی شخصیت میں شیطنت دیکھی۔ اسی زمانے میں طالب علمی کے زمانے کے قریبی دوست، مور سے بھی اس کا جھگڑا ہو گیا اور وہ بھی ایک دوسرے کی صورت سے نفرت کرنے لگے۔ اسے رسل کی کمزوری کہیئے یا خوبی کہ وہ نظریات کے معاملے

میں مفاہمت پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ مفاہمت پسندی کی اس کمی نے رسل کو مقبول بھی بنایا اور نامقبول بھی۔ کیمبرج میں قیام کے دوران اس نے ایک اور ذہنی کارنامہ انجام دیا جس سے وہاں کے علمی حلقوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ کیمبرج میں ایک انجمن تھی جو 'انجمن منکرین' کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام اس نے برگساں کے مشہور متصوفانہ نظریۂ ارتقاء پر ایک لکچر دیا۔ اس لکچر میں لوگ بڑے اشتیاق سے شریک ہوئے اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس فلسفے کی دھجیاں اڑائے گا۔ رسل نے اپنے مخصوص منطقی، استدلالی اور طنزیہ انداز میں اپنا یہ معرکۃ الآرا لکچر دیا۔ اس لکچر نے کیمبرج میں اسے ایک ممتاز حیثیت بخش دی۔ کیمبرج کے ہی زمانۂ قیام میں اس نے ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ کے لئے وہ لکچر تیار کئے جو بعد میں کتابی صورت میں 'خارجی دنیا کے بارے میں ہمارے علم' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ دمشق کی خاطر رسل نے کیمبرج میں یہ لکچر دئے جو بے حد مقبول ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ سے کچھ دنوں پہلے وہ امریکہ گیا اور اسے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ امریکیوں کی کشادہ ذہنی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ امریکی نئے افکار کو قبول کرنے اور نامانوس راہوں کو اختیار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

"جامعہ کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے کارکنوں نے کبھی فرقہ پرستی کی سرد اصطلاحوں اور تنگ دائروں میں نہ سوچا ہے نہ عمل کیا ہے۔ اس کی تاسیس میں مہاتما گاندھی کا آدرش اور فکر وعمل کار فرما رہا ہے۔ ہر دور میں اس کے اساتذہ اور طلبا کی صف میں غیرمسلموں کی خاصی تعداد رہی ہے اور یہ مسلم تعلیمی وتہذیبی اداروں کا ایسا نمایاں امتیاز اور خصوصی روایت رہی ہے جس کی نظیر ملک کے اسی طرح کے دوسرے اداروں میں نہیں ملتی۔"

(خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ منعقدہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

محمد اجتبا حسینی

تصوّف پر
علامہ ابن خلدون کی ایک نادر کتاب
"شفاء السائل لتهذيب المسائل"

آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اندلس کے فقراء ــــــ اس دور میں اندلس کے صوفیاً اسی نام سے یاد کئے جاتے تھے ــــ کے درمیان یہ اختلاف ہوا کہ آیا مرید (صوفی) کو سلوک و تربیت کے لئے "کسی شیخ" کی ضرورت ہے یا تصوف وسلوک کی کتابیں اس کی تربیت وطریقت کے لئے کافی ہیں، بحث ومناظرہ اور اختلاف اس حد کو پہونچا کہ بقول علامہ ابن خلدون ملت میں دو فرقے رونما ہوئے جن میں مارپیٹ، گالی گلوج اور جوتے بازی ہوئی، مسئلہ جب اندلس میں حل نہ ہوسکا تو مغرب اقصیٰ کے علماء اور صوفیاء سے استفتاء کیا گیا، فتویٰ دینے والوں میں علامہ ابن خلدون کا ذکر بھی ملتا ہے۔

زیر نظر کتاب وہی فتویٰ ہے جو ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کے آخر میں علامہ ابن خلدون کا تصوف کے بارے میں اور ابن عباد و ابوالعباس القباب کا اس متنازع فیہ مسئلہ سے متعلق فتویٰ شامل ہے، انقرہ (ترکی) کے شعبۂ الٰہیات کے پروفیسر استاذ محمد بن تاویت الطنجی نے اپنی گرانقدر تحقیق وترتیب اور مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کیا ہے، مقدمہ بہت جامع، محققانہ اور تفصیلی جائزہ اور وضاحت پر مشتمل ہے۔

کتاب اس اعتبار سے نادر اور گرانمایہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے قلم سے تصوف پر ایک مستقل اور پرمغز بحث ہے اور اس دور کے صوفیاء، تصوف، علماء کے موقف، عوام کے رجحانات اور قومی کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

کتاب کے بارے میں یہ سوال ذہن میں ابھرنا قدرتی بات ہے کہ یہ ابن خلدون کی ہی تصنیف ہے یا کسی غیر معروف مصنف نے اسے اس عظیم مفکر اور مایۂ ناز مصنف سے منسوب کر دیا ہے۔

فاضل مقدمہ نگار نے اس موضوع سے سیر حاصل بحث کی ہے اور پوری کتاب پر ایک محققانہ نظر ڈالی ہے، استاذ محمد بن تاویت کا خیال ہے کہ یہ کتاب علامہ ابن خلدون کی تصنیف ہے اور اس کی دلیل میں مندرجہ ذیل شواہد پیش کئے ہیں:

۱۔ اگرچہ ابن خلدون نے اس زمانہ کے رواج کے مطابق اپنی تصنیفات میں اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور نہ کوئی عبارت اس قسم کی لکھی ہے جیسی کہ "مقدمہ"، "تاریخ" اور اپنی دیگر تصنیفات پر درج کی ہے، جس سے ثابت ہو کہ یہ انھیں کی تالیف ہے اور نہ ان کے معاصر مورخین، تذکرہ نویس ابن الخطیب اور ابن الاحمر نے کوئی ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کی تردید اور انکار بھی نہیں کیا ہے، مقدمہ نگار کا خیال ہے کہ علامہ ابن خلدون نے اس کو اپنی تصنیفات میں اس وجہ سے شمار نہیں کیا کہ یہ ایک فتویٰ ہے اور تصوف پر کوئی فتویٰ یا تصنیف اس زمانہ میں قابل تعریف اور لائق ستائش نہیں سمجھی جاتی تھی۔

۲۔ استاذ محمد بن تاویت کے پیش نظر جو نسخہ تھا اس پر ابن خلدون کا ہی نام درج ہے اور اس کے بائیں جانب ایک معروف مراکشی عالم شیخ ابوعلی حسن بن مسعود الیوسی (المتوفی ۱۱۱۱ھ) کے قلم سے لکھی ہوئی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ان کی ملکیت میں تھی۔ دوسری عبارت اس سے متصل یہ اشارہ دیتی ہے کہ یہی کتاب ان کے بیٹے عبدالکریم الیوسی کی ملکیت میں ۱۱۳۶ھ میں آئی، یہ دونوں بزرگ مراکش کے ثقہ اور قابل اعتماد عالم ہیں اور ان دونوں نے کہیں اس

کتاب کے مصنف کی نسبت سے تردید اور انکار نہیں کیا ہے۔

۳۔ فقراء اندلس کے اس مناظرہ کا تذکرہ مشہور صوفی بزرگ شیخ ابوالعباس احمد بن محمد زروق الفاسی المتوفی (۸۹۹ھ) نے اپنی کتاب "قواعد التصوف" میں تفصیل سے کیا ہے۔ مجموعی طور پر جوابات میں تین باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:

ا۔ صوفیاء اور مشائخ۔

ب۔ مرید کی حالت۔

ج۔ ریاضت اور مجاہدات۔

۴۔ شیخ احمد زروق نے اپنی دوسری کتاب "عدۃ المرید" میں بھی اس مسئلہ پر علامہ ابن خلدون کے فتوے کا تذکرہ کیا ہے۔

۵۔ شیخ ابوسالم العیاشی (۱۰۹۰ھ) نے اپنی تصنیف علم الحروف میں بڑے وثوق سے ذکر کیا ہے کہ ابن خلدون نے اس مناظرہ میں حصہ لیا اور فتویٰ دیا ہے جو بہت مشہور رہے۔

۶۔ مراکش کے ایک عالم اور بزرگ شیخ ابومحمد عبدالقادر الفاسی (۱۰۹۱ھ) نے تحریر کیا ہے کہ آیا راہِ طریقت طے کرنے کے لئے "شیخ" کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اندلس کے متاخرین صوفیاء نے "شیخ" کے بجائے کتابوں پر اکتفا کر لینے میں اختلاف کیا ہے اس کے بارے میں ان لوگوں نے استفسار کیا، اس کے جوابات شیخ ابن عباد اور ابوزید ابن خلدون نے حسب توفیق دیئے ہیں۔

۷۔ شیخ ابوعبداللہ محمد بن احمد المسناوی (۱۱۳۶ھ) نے اپنی کتاب "جہد المقل القاصر" میں اس کتاب کو ابن خلدون کی تصنیف بتائی ہے۔

۸۔ تصوف وسلوک سے متعلق ابوبکر الشریشی کے قصیدہ "الرائیہ" کی شرح کرتے ہوئے شیخ ابوالعباس احمد بن یوسف الفاسی (۱۰۲۱ھ) نے اس کتاب کو ابن خلدون کے گھرانہ کی جانب منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے دادا یا والد یا بھائی کے قلم سے یہ فتویٰ لکھا گیا لیکن اندلس میں اس اختلاف کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی ابن خلدون کے والد اور بھائی کا انتقال

ہو چکا تھا اور دادا اس سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے، اس لئے یقیناً یہ فتویٰ علامہ ابن خلدونؒ کا تحریر کردہ ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے اس طویل فتوے میں صرف ایک وقتی اختلافی مسئلہ ہی سے بحث نہیں کی ہے بلکہ تصوف وسلوک، فقہ ظاہر وفقہ باطن، تصوف کے مفہوم ومدلول، تصوف صحابہ کے عہد میں، تصوف صحابہ کے بعد، تصوف کی شکلیں اور تصوف متاخرین مشایخ کی نظر وعمل میں کیا ہے، ان سب پر روشنی ڈالی ہے۔

ابن خلدون نے بڑی جرأت اور صراحت سے ان سارے موضوعات کا شواہد، دلائل اور مثالوں کی روشنی میں مکمل جائزہ لیا ہے۔

طریقۂ تصوف کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ تصوف کے صرف دو طریقے ہیں؛

۱۔ پہلا سنت کا طریقہ جو کتاب وسنت اور سلف صالحین میں سے صحابہ کرامؓ اور تابعین کی پیروی اور اتباع ہے۔

۲۔ دوسرا متاخرین صوفیاء کی ایک جماعت کا طریقہ ہے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ بدعت آلود ہے، اس طریقہ میں تصوف ذوقی معرفت اور احساس کی پردہ دری پر مبنی ہے۔ اس طریقہ کے رہ نوردوں میں ابن عربی، ابن سبعین، ابن برجان اور ابن قسی کا ذکر کیا ہے، اور ان کی کتابوں "الفتوحات المکیۃ"، "الفصوص" اور ابن سبعین کی "بدالعارف" ابن قسی کی "خلع النعلین" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حکام اور ذمہ داروں کو چاہئے کہ مصلحت عامہ کے پیش نظر ان کتابوں کو جلادیں یا ان کے حروف کھرچ دیں کہ سب مٹ جائیں، امت کے جن لوگوں کے پاس اس قسم کی کتابیں ہوں وہ حکام کے سپرد کردیں۔

شریعت کو اعمال ظاہرہ اور باطنہ میں تقسیم کرتے ہوئے حدیث جبرئیل علیہ السلام اور عقائد واعمال کی حدیثوں سے استشہاد کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ تصور نہیں کرتے تھے،

چونکہ اعمال ظاہرہ اختیاری ہیں اور اعمال قلبیہ غیر اختیاری ہیں اس لئے صحابہ کے بعد فقہ دو قسموں میں تقسیم ہوگئی،

فقہ ظاہر اور فقہ باطن

صدر اول پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : "پھر عقائد، عبادات اور زہد میں بدعت رونما ہوئی، کوئی معتزلی ہوا، کوئی رافضی، تو کوئی خارجی، فساد عقیدہ کے ساتھ ظاہری اور باطنی اعمال کی اصلاح سود مند نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ظاہری اور باطنی اعمال میں سلف صالحین کے پیرو اہل دل نے سنت کا طریقہ اپنایا اور صوفیاء کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔

ہجرت کی دو صدی کے اندر تصوف کے لفظ کا رواج ہوا، اور گروہ در گروہ، نسل در نسل یہی طرز "شیخ" کے واسطہ سے منتقل ہوتا رہا، اور فقہ شریعت کی دو شکلیں ہوگئیں :

۱۔ فقہ ظاہر : یعنی ان احکام سے واقفیت حاصل کرنا جن کا تعلق مکلفین کے جسم و اعضاء کے ظاہری اعمال، عادات اور عبادات سے ہے، اسے "فقہ" کہا گیا اور اس علم سے واقفیت رکھنے والے کو "فقیہ" جو اہل فتوی اور دین کے حامی و محافظ قرار پائے۔

۲۔ فقہ باطن : یعنی ان احکام سے جانکاری رکھنا جن کا تعلق مکلفین کے دل و اعضاء کی عبادت اور لوازمات سے ہے، اس کو "فقہ قلب یا فقہ باطن یا فقہ زہد، علم آخرت اور تصوف" کا نام دیا گیا۔

اس بارے میں فقہاء و صوفیاء کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

فقیہ کی نظر دنیاوی مصالح پر پڑتی ہے، اور صوفی کی نظر اخروی مصالح پر رہتی ہے۔

علامہ ابن خلدون "تصوف" کے لفظ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس لفظ کے بارے میں مختلف رائیں ہیں :

لفظ صوف (اون) سے نکلا ہے، زاہدوں نے اپنی بے بضاعتی، کم مائگی کے احساس، تقشف اور نفس کشی کی خاطر یہ لباس اختیار کیا، کیونکہ ان لوگوں کا ظاہری چمک دمک، ٹیپ ٹاپ اور آن بان

کی جانب قلبی میلان نہیں تھا، حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ : اگر تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ اپنے ظاہر کو سنوارتا اور اس کا خیال رکھتا ہے تو جان لو کہ اس کا باطن اچھا نہیں ہے۔ (قشیری ص۱۴۶)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ "صفہ" سے لیا گیا ہے، مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترہ تھا، صحابہ کرامؓ میں ایسے لوگ اس جگہ قیام کرتے تھے جو پردیسی یا اکیلے تھے جیسے حضرت ابو ہریرہؓ ابوذر غفاری، سلمان فارسی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم۔ مگر یہ حضرات دوسرے صحابۂ کرام سے عبادت، ریاضت اور زہد و تقویٰ کے طریقوں میں کچھ مختلف نہیں تھے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ "صفاء" سے ہے، کیونکہ تزکیۂ نفس اور صفائی قلب پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ اسی سے صوفی، صوفیاء، اور تصوف کا لفظ نکلا۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن خلدون اپنی کوئی قطعی رائے تحریر کئے بغیر تصوف کی تعریف بیان کرنے لگتے ہیں اور دوسرے محقق بزرگوں کی رائیں بھی نقل کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ :

"ظاہری اور باطنی اعمال میں خدا تعالیٰ کے ساتھ حسن ادب کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اس کی حدود پر قائم رہنا، اعمال قلب کا اہتمام اور اس کو ترجیح دینا، قلب کی پوشیدہ کیفیات کی نگہبانی کرنا اور نجات کا خواستگار ہونا، تصوف ہے۔"

"عمدہ اخلاق کا اختیار کرنا، اور گھٹیا اخلاق سے پرہیز کرنا، تصوف ہے"

(قشیری، کلاباذی، مکی)

"اعلیٰ اور شاندار اخلاق، نرمی، مہربانی، شفقت، حریت، بلند حوصلگی، اور جوانمردی"

"سخاوت کی فراوانی اور بلند خلقی، مخلوق کا عذر قبول کرنا، ساتھیوں کی بہترین رفاقت، ان کی خدمت، عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کرنا۔"

"تصوف کچھ رسموں، شکلوں اور عادتوں کا نام نہیں بلکہ اخلاق کو تصوف کہتے ہیں۔"

(طبقات الصوفیہ، السلمی)

[redacted]

صوفی کے بارے میں واضح الفاظ میں رقمطراز ہیں :

"صوفی وہ شخص ہے جو لوگوں کی ہر رنگ زندگی میں شریک ہو اور کسی طرح ان سے ممتاز اور الگ نہ ہو، نہ کنارہ کش ہو، وہ اسلامی اصول وروح کی پابندی اور لوگوں کے ساتھ شرکت سے اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور استحکام کا باعث بنے گا، لوگ اس کے قول وعمل کی پیروی اور اتباع کریں گے۔ اس طرح مسلمانوں میں اسلامی اخلاق، اسلامی روح ومزاج کا چرچا اور رواج ہوگا۔"

شیخ ابو یزید بسطامی (۲۲۴ھ) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

"جو شخص بھی قرآن پاک کی تلاوت، سادہ زندگی، جماعت کی حاضری، جنازے کی شرکت ومشایعت، بیماروں کی مزاج پرسی کو چھوڑ کر کنارہ کش ہوگیا اور تصوف کا دعویٰ کیا تو وہ بدعتی ہے۔" (تلبیس ابلیس ص۱۶۷)

یہ کام عبادتوں، مجاہدوں اور ریاضتوں سے حاصل ہوتا ہے، ان مجاہدات کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مجاہدۂ تقویٰ : یعنی خدا تعالیٰ کی بیان کردہ حدود پر قائم رہنا، اس سے تجاوز کرنا اور اس سے الگ اپنی راہ اختیار کرنا مجاہدہ نہیں ہے، کلام پاک کی آیتوں اور احادیث نبوی سے استشہاد کرتے ہوئے بہت مفصل خاکہ پیش کیا ہے۔

۲۔ مجاہدۂ استقامت : اس سے مراد نفس کی اصلاح، اس کو تمام اخلاق وصفات میں میانہ روی اختیار کرنے پر آمادہ کرنا، تاکہ اس کا عادی ہوجائے اور اس سے بآسانی اچھے اخلاق واعمال صادر ہونے لگیں، ریاضت وتزکیہ سے قرآن ونبوت کے آداب فطری عادت بن جائیں گویا کہ نفس اسی کا عادی اور مانوس ہے۔

۳۔ مجاہدۂ کشف : اس کے لئے کچھ شروط وآثار اور علامتیں لکھتے ہیں۔

آخر میں ابن خلدون اصل مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ طویل بحث صرف اس وجہ سے کی گئی تاکہ ناواقف و ناداں لوگ حقیقت سے باخبر ہو جائیں۔"

بعض حالات میں "شیخ" کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے تقویٰ کے بارے میں کتاب و سنت کی رہنمائی پر اکتفا کیا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت میں سالک اور مرید کے لئے "شیخ" ضروری ہے، اس لئے کہ کتاب اور منقول اسے اس کے مقصد تک رہنمائی نہیں کر سکتے ہیں، اس وجہ سے بھی کہ یہ طریقہ کسبی و کاروباری علوم کی طرح واضح اور معلوم نہیں ہے بلکہ یہ الہامی اور وجدانی طریقہ ہے جو اکثر حالات میں غیر اختیاری ہے، اور مخصوص اعمال کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، کسبی علوم سے اس کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، چنانچہ کسی ایک "شیخ" کا ہونا لازمی ہے جو بصر و بصیرت کے ذریعہ اس کو واضح اور عیاں کرے اور ان اعمال کی شکلوں اور کیفیتوں کی خصوصیات بتائے، جس سے یہ طریقہ حاصل ہوتا ہے۔ اس جگہ انداز بیان اور طرز نگارش میں بڑا زور پیدا ہو گیا ہے۔ بہت واضح اور صاف صاف لکھتے ہیں تاکہ کوئی پیچیدگی، ابہام اور شک و شبہ باقی نہ رہے اس سے کتاب کی افادیت، اہمیت اور قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔

جامعہ ـــــ جشن زریں نمبر

ڈاکٹر سید احتشام ندوی

ادبی تخلیق کیا ہے؟

ادبی تخلیق کیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ دراصل ادبی تخلیق کا مطلب کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود مادہ میں ایک نئی روح پھونکنا ہے۔ یہ درحقیقت اس خالق اعظم کا طریق صنعت ہے جس نے آدم علیہ السلام کو لفظ "کُن" کہہ کر پیدا نہیں کیا بلکہ مٹی لیکر اس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کی اور اس میں روح پھونکی یعنی ایک ایسے مادہ سے خالق اعظم نے ان کو بنایا جو ان سے قبل موجود تھا۔

اس حقیقت سے یہ اصول واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ "لاشئ" سے کوئی شے ظہور میں نہیں آتی بلکہ شئ سے شئ ظہور میں آتی ہے جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس لئے یہ خیال خام ہے کہ ادیب کوئی ایسا موضوع اختیار کرے جو اس سے قبل وجود میں نہ آیا ہو اور کسی کا ذہن اس کی جانب منتقل نہ ہوا ہو۔ اصل ادبی تخلیق یہ ہے کہ ادیب انسانی زندگی کے کسی معروف پہلو کو لیکر اپنے فکروفن سے اس میں ایک نئی روح پھونک دے۔ معروف فکر میں ایک فنکارانہ اعجاز اور نیا انداز پیدا کرے جس سے عقل کو تحیر اور دل کو حسن کی دولت ملے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی فرسودہ موضوع میں ادیب اپنے فکروفن سے رنگ ونور کا ایک نیا عالم پیدا کرے۔

مشرق ومغرب کے ادیبوں میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، مثلاً ایک ادیب یا شاعر دوسرے ادیب سے فکر مستعار لے لیتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شکسپیر کے اکثر موضوعات بوکاشیو سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح مولیئر کے بعض موضوعات مکارن سے مستعار ہیں۔ اسی طرح راسین کی

کی ٹریجڈی ایروبیڈس وغیرہ سے مستعار ہے۔ اسی طرح اشیل نے ہومر سے کسب فیض کیا ہے۔ خود عربوں میں "سرقہ" کا مدتوں ایک نہایت گرم اور خصومت انگیز موضوع تنقید میں داخل تھا حتی کہ آمدی نے دعویٰ کیا کہ ابوتمام کے تمام اشعار دوسرے شعراء سے سرقہ کئے ہوئے ہیں سوا تیس شعروں کے۔ بعد کے ناقدوں نے یہ طے کر دیا کہ موضوعات کی یکسانیت سرقہ نہیں ہے سوا اس کے کہ کوئی شاعر اپنا خاص تخیل پیدا کرے اور اس کو دوسرا شاعر لے کر اپنائے تو یہ سرقہ ہے، باقی مشترک موضوعات میں سرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی موضوع کو نیا رنگ اور نیا قالب عطا کرنا آسان نہیں ہے، ایک ایسا قالب جو ہر زمانہ اور نسل میں نیا معلوم ہو، ادیب کو اپنی تخلیق میں وہ انداز پیدا کرنا چاہئے جو بہار میں پوشیدہ ہے۔ بہار بار بار آتی ہے مگر رنگ بہار کبھی فرسودہ نہیں محسوس ہوتا۔ جس طرح موسم بہار میں انسان کے دل و دماغ پر ایک تازگی اور شگفتگی طاری ہوتی ہے، بالکل اس انداز سے ادبی تخلیق کرنی لازم ہے جو زمانہ کے امتداد کے باوجود رونق، تازگی، دلکشی اور زندگی کی بھرپور کیفیت سے پُر ہو۔

ادبی تخلیق نہ قدامت ہے نہ جدیدیت، نہ غرابت ہے اور نہ مالوف انداز، پھر آخر وہ کیا ہے؟ ادبی تخلیق کا اصل نمونہ خود انسان ہے! خالق اعظم نے اربوں انسان پیدا کئے۔ ان کی شکل، آواز، ذوق، عقل، خواہش، فکر اور ہر شئے دوسرے انسان سے مختلف ہے اگرچہ بہ ظاہر چیزیں وہی ہیں مگر کیفیت میں ہر انسان ہر لحاظ سے دوسرے سے انفرادیت و امتیاز کا حامل ہے۔ خدا کی تخلیق کی یہ انفرادیت، قوت، احساس، عقل اور روح ہر شے میں موجود ہے بس اسی انسانی انفرادیت و عظمت کو ادب میں اپنے موہوب ذرائع کے مطابق نمایاں کرنا ادبی تخلیق ہے۔ درحقیقت شخصیت کا اظہار حسن کا معجزہ ہے۔ ادبی تخلیقات فنی عجائبات کا مظہر ہیں۔ خدا نے ذرہ سے ستارہ تک جو نظام تخلیق و تنظیم رکھا ہے وہی نظام یہاں بھی کار فرما ہے۔

ادیب ایک مخصوص و منفرد شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ فنکار کو اپنی شخصیت کی تلاش مسلسل جاری رکھنی چاہئے حتی کہ وہ اس کو پالے۔ ادیب کی معراج یہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کا تا ابد

مالک بن جائے۔ جو کچھ وہ لکھے اس پر اس کی مہر لگ جائے۔ غالبؔ، اقبالؔ، شبلیؔ اور نذیرؔ احمد وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے اس پر ان کی شخصیت کی مہر ثبت ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ادیب دوسرے کی اتباع کرنا چاہتا ہے مگر اس کی اپنی ادبی شخصیت تتبع پر غالب آتی ہے اور اس کی مہر اس پر ثبت کر دیتی ہے۔ شخصیت ایک زبردست "سیلاب" ہے جو اس طرح بہتا ہے کہ اپنی راہ خود متعین کر لیتا ہے۔ ہر ادیب و فنکار کی شخصیت، اس کا اسلوب، فکر و تعبیر اور امور و اشیاء کے تجزیہ میں اس کا اپنا منفرد انداز نظر ہوتا ہے، یہی جھلک فنی تخلیق ہے۔

ابتداء میں انسان دوسرے کے سہارے آگے بڑھتا ہے مگر رفتہ رفتہ تقلید اس کی گھٹی میں پڑ جاتی ہے، دوسری شخصیتیں اس پر چھا جاتی ہیں، اسی لئے ایک ناقد نے کہا کہ "اگر انسان ہمیشہ بچہ رہ جائے تو وہ شاعر بن جائے" اس لئے کہ بچے کے اندر جہاں تقلید کا مادہ ہے وہاں آزادانہ فکر کا زبردست مادہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر جستجو کی لگن اور تلاشِ حقیقت کا جذبہ ہوتا ہے۔ بڑی شخصیتیں تقلید سے اپنا دامن چھڑا کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔

ادیب کی ذات اس کے ادب پر چھائی رہتی ہے۔ ادبی تخلیق میں وہ مخصوص فضا قاری کو محسوس ہوتی ہے جس میں اس نے یہ تخلیق انجام دی ہے۔ ادیب کا سب سے بڑا فن یہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کا ٹھپہ اپنے ادبی کارناموں پر ثبت کر دے۔

ادبی تخلیق کا مخاطب پورا سماج ہے، اس کے مسائل ہیں اور اس کی ترجمانی ہے۔ وہ دل کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں زندگی کے بے شمار پہلوؤں، نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کو کچھ دینے اور اس کی مشکلوں کو کچھ کم کرنے کا جذبہ بھی ہونا چاہیئے۔ جدید ادبی تخلیق محض ترجمانی نہیں ہے بلکہ زندگی کے اندھیرے میں اس کو ایک کرن بننا چاہیئے۔ فسردہ دلوں میں روشنی پیدا کرنی چاہیئے۔ جس طرح نئے انسان کی آمد سے دنیا میں رونق ہوتی ہے اور لوگ زندگی و تابندگی محسوس کرتے ہیں اسی طرح نئی ادبی تخلیق کو زندگی کے لئے باعث سکون و قرار اور رونق و عظمت بننا چاہیئے۔ جس طرح شگفتہ پھول سے چمن کی رونق بڑھتی ہے، خوشبو پھیلتی ہے، رنگینی پیدا ہوتی ہے اسی طرح نئی تخلیق کو نئے حسن، نئی زندگی اور نئے سامانِ بہار کا ترجمان ہونا چاہیئے۔

(عربی سے اپنایا ہوا)

وقار خلیل

جامعہ ملیّہ کے نام

(جشنِ زرّیں کے موقع پر)

اک ایسی جامعہ کی گولڈن جبلی مناتے ہیں :
جہاں انسانیت اپنے شرف پر ناز کرتی ہے
وفا کی، پیار کی، اخلاص کی قندیل جلتی ہے
لباسِ لالہ وگل میں کئی مہتاب ڈھلتے ہیں
اندھیرے قتل کرنے یوں نئے سورج نکلتے ہیں
چراغاں کا سماں ہے اور اُجالے رقص کرتے ہیں

مساوات اور رواداری کا سرچشمہ کہیں جس کو
اک ایسی جامعہ، ذاکر نے جس کی پاسبانی کی
اک ایسی جامعہ، ہندستاں میں اب بھی باقی ہے
مجیبِ علم ودانش سا قلندر جس کا ساقی ہے
وہ ملی جامعہ قومی ثقافت سے عبارت ہے
شبِ تیرہ میں بے شک زندگانی کی بشارت ہے
ہم ایسی جامعہ کی گولڈن جبلی مناتے ہیں
جہاں تاریخ کو کچھ لوگ آئینہ دکھاتے ہیں

جامعہ کا جشنِ زرّیں

۲۷ر - ۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

جامعہ کا جشن زریں، اعلان کے مطابق، ۲۷ر سے ۳۰ر اکتوبر تک منایا گیا، جشن کا مفصل پروگرام حسب ذیل تھا:

منگل، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

۹¾ بجے صبح ... ... افتتاح جشن زریں

½۱۱ بجے صبح .... سیمینار: "تدریس اردو کے مسائل"

۲ بجے سہ پہر..... .... "گاندھی ٹرافی" کے مقابلے

۸ بجے شب............ ڈرامے: ۱۔ ٹیپو سلطان ۲۔ دھنک

بدھ، ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

½۹ بجے صبح .... سیمینار: "تہذیبی اقدار کی ماہیت پہچاننے اور انھیں نئی نسلوں تک پہنچانے میں یونیورسٹیوں کا رول"

۱۱ بجے صبح............ سیمینار: "ہندوستانی مسلمانوں کے سوشل ویلفیر کے مسائل"

۲ بجے سہ پہر............ "نہرو ٹرافی" کے مقابلے

۸ بجے شب .... ڈرامے: ۱۔ چلیے آپ ۲۔ تماشا مرے آگے

جمعرات، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

½۹ بجے صبح .... بیت بازی

۱۰ ½ بجے صبح .... طلبائے قدیم کا جلسہ

۱۰ ½ بجے صبح .... محفل خواتین (صرف خواتین کے لیے)

۲ بجے سہ پہر .... محفل موسیقی

۸ بجے شب .... ڈرامہ : خانہ جنگی

جمعہ، ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء

۱۰ ½ بجے صبح .... جلسۂ یوم تاسیس

۷ بجے شب .... ڈرامہ : جب تک چمکے سونا

جلسے اور کانووکیشن

چار دن کے اس پروگرام میں تین جلسے ایسے تھے، جن کا یہاں میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، ایک افتتاحی جلسہ، دوسرا طلبائے قدیم کا سمپوزیم، تیسرا جلسۂ یوم تاسیس۔

جشن کے افتتاح کے لیے نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال سروپ پاٹھک صاحب سے درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے از راہ عنایت اسے منظور فرمایا اور تشریف لائے۔ جلسے کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا، اس کے بعد شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جناب پاٹھک صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

میں جامعہ ملیہ کے طالب علموں اور استادوں کی طرف سے آپ کا سواگت کرتا ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اس مبارک موقع پر ہماری ہمت افزائی کے لئے تشریف لائے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد اب سے پچاس برس پہلے رکھی گئی تھی، جب گاندھی جی نے ہمارے سامنے اس خیال کو پیش کیا کہ قوم کی تعلیم کو قوم کے اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ ستائیس برس تک اس کا مطلب یہ تھا کہ جامعہ اپنے اسکول اور کالج کے لیے حکومت سے مدد نہ مانگے۔ قوم جو جو کچھ اسے دے سکتی ہو یا دینا چاہے اسی سے اپنا کام چلائے۔ تیئیس برس سے اس کا مطلب

یہ ہے کہ ہم اپنی آزاد حکومت کو یہ سمجھائیں کہ آزادی کے بعد بھی ہماری ضرورت باقی ہے، اور حکومت ان قاعدوں کے اندر جو آزادی سے پہلے بنے تھے ہمیں جو کچھ دے سکتی ہو اسے بہت سمجھیں۔ انگریزی حکومت کے بنائے ہوئے قاعدوں کو ہتکڑی بیڑی بنا لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جامعہ ملیہ ہی نہیں بلکہ اور ادارے بھی جو اس کے ساتھ قائم ہوئے تھے لاوارث ہو گئے اور اب بھی کچھ لاوارث سے ہیں۔ آزادی سے پہلے جامعہ کی لاوارثی دوسری قومی سنستھاؤں سے کچھ زیادہ تھی، اس کے لیے قوم سے مراد وہی لوگ تھے جو ہماری زندگی کو پریم اور اتحاد کی مثال بنانا چاہتے تھے، باقی سب اس کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے یا اس کے خلاف تھے۔ پھر ہماری دشواریاں اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئیں کہ ہم قومی تعلیم کو بہتر سے بہتر تعلیم بنانے کا حوصلہ رکھتے تھے، ہم نے کبھی خرچ کو آمدنی کے اندر نہیں رکھا، آمدنی کو خرچ کے حساب سے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔ آمدنی میں بھی ہم نے اپنی ضرورتوں کا نہیں ماں باپ کی مجبوریوں کا خیال رکھا، اور اب بھی آپ دیکھیے تو ہمارے یہاں کا تعلیمی خرچ دوسری جگہوں سے کم ہی ہوگا۔ یہ ناممکن سی بات کہ استادوں کی ضرورتیں پوری نہ ہوں اور ان کے تعلیمی حوصلے بڑھتے رہیں، وہ اچھے سے اچھا کام کریں چاہے اسے سراہنے والے کم ہوں یا نہ ہوں، ایک چھوٹی سی سنستھا پریم کے گیت گاتی رہے چاہے اس کے چاروں طرف نفرت کی آگ کبھی سلگتی کبھی بھڑکتی رہے، یہ ناممکن سی بات ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی شخصیت نے ممکن کر کے دکھا دی۔ ہمارے اوپر ان کی شخصیت کا اتنا اثر تھا کہ جب ان سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کاموں کو سنبھالنے کے لیے کہا گیا تب بھی ہمارے سب کام پہلے کی طرح جاری رہے، اور اب جامعہ ملیہ اس کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ ان کی سچی یادگار ہے۔"

اپنی تقریر کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا:

"جس زمانے میں جامعہ ملیہ آزاد قومی تعلیم کی علم بردار تھی، لوگ پوچھا کرتے تھے کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے۔ آج کل بھی ہم سے یہی پوچھا جاتا ہے۔ کوئی اسکول، کالج یا یونیورسٹی قائم کی

جائے تو یہ سوال نہ کیا جائے گا، اگرچہ یہ بحث برابر جاری ہے کہ خود تعلیم یعنی پورے ملک کی تعلیم کے نظام سے کچھ حاصل ہوتا ہے یا نہیں اور ہوتا ہے تو کیا۔ جامعہ ملیہ استادوں اور طالب علموں کی ایک سنستھا ہے جو ایک خاص تہذیب کے سائے میں سیکھنے سکھانے کا کام کرتی رہی ہے اور سماجی زندگی، سیاست اور مذہب کی مدد سے نئی نسلوں کی طبیعت کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی رہی ہے جس سے ان کی انسانیت اجاگر ہو اور وہ اپنے ملک کے تندرست، کارپرداز اور حق پرست شہری بن سکیں۔ اس کام کو کرتے ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں، اس کا ہم جشن منا رہے ہیں اور میں اب آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس جشن کا افتتاح فرمادیں۔"

نائب صدر جمہوریہ جناب گوپال سروپ پاٹھک صاحب نے جن کی تقریر اردو میں تھی، شیخ الجامعہ، اساتذہ، طلبہ اور حاضرین جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

میں آپ سب کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس عظیم الشان ادارہ کے جشن زریں کے افتتاح کے لئے دعوت دی۔ اس مبارک موقع پر جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے پچاس سال پورے کرلئے ہیں آپ سب کے ساتھ شریک ہو کر میں اپنے لئے عزت افزائی سمجھتا ہوں۔ میں ان تمام بزرگ اور مجاہدان وطن ہستیوں کو خراج عقیدت اور مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے جامعہ کو بنانے، ترقی دینے اور پھر اس کو ایک اعلیٰ یونیورسٹی کے پیمانہ پر لانے میں اپنے آپ کو وقف کیا۔

میں نے جامعہ کو ایک اعلیٰ یونیورسٹی اس لئے کہا کہ میری رائے میں محض طالب علموں کی تعداد یا کسی بڑی عمارت سے کوئی یونیورسٹی اعلیٰ یونیورسٹی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اعلیٰ یونیورسٹی وہ ہے جو اچھے اور اعلیٰ اصولوں کو اپنے سامنے رکھے اور جو اونچے خیالات کو نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کر سکے اور ملک و قوم کی خدمت کے لئے انھیں تیار کر سکے۔ وہاں کے استادوں میں کام کرنے کی سچی لگن ہو اور قربانی کا جذبہ ہو۔ یہ سب چیزیں جس یونیورسٹی

میں موجود ہوں اس کو اعلیٰ یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے۔ اور آپ کی اس یونیورسٹی میں یہ ساری خوبیاں پوری طرح موجود ہیں۔

یہ بہت ہی افسوس اور بدقسمتی کی بات ہے کہ اس اعلیٰ تعلیمی ادارہ کے اس جشن زریں کے مبارک موقع پر آج ہمارے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب موجود نہیں ہیں جنھوں نے اس ادارہ کے لئے اپنی قیمتی زندگی کے ۲۷ سال بڑی لگن کے ساتھ گزارے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس ادارہ کے روح رواں تھے وہ صرف اسلامی تہذیب ہی کے نمایندے نہیں تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں ہمارے سیکولرازم کے ایک اعلیٰ نشان بھی تھے۔ وہ ہمارے دیش کے اعلیٰ درجہ کے دیش بھگت محب وطن تھے۔ وہ بڑے ہی انوکھے اور اعلیٰ انسان تھے اور ایک ایسے عالم باعمل تھے جن میں ہر کام کو اعلیٰ پیمانہ پر کرنے کی لگن ہوتی تھی۔ ان کی یہی ساری خوبیاں اور اس ادارہ کی خدمات ایسی تھیں کہ انھیں اس عظیم ملک کے اعلیٰ عہدہ کا حقدار بنا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب میری اس بات کو مانیں گے کہ اس تعلیمی ادارہ کے ساتھ جن کا تعلق خواہ استاد کی حیثیت سے ہو یا طالب علم کی حیثیت سے ہو، آج یا آنے والے کل میں: ان سب پر ذاکر صاحب کی انسانیت اور خوبیوں کا اثر ہمیشہ قائم رہے گا اور وہ سب ہمیشہ ذاکر صاحب کے مشکور رہیں گے۔ میں ان تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے اس ادارہ کو قائم کرنے اور ترقی دینے میں اپنا ہاتھ بٹایا۔ ذاکر صاحب کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ جامعہ دھیرے دھیرے ترقی کر رہا ہے اور اس کی ترقی کی حدیں آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔"

طلبائے قدیم کے سمپوزیم کا عنوان تھا: "آج کے ہندوستان میں جامعہ کا رول"۔ جلسہ جامعہ کے ایک قدیم طالب علم جناب معین الدین حارث صاحب (مدیر روزنامہ اجمل، بمبئی) کی صدارت میں شروع ہوا، جن کا خطبۂ صدارت جامعہ کے اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ خطبۂ صدارت

کے بعد جناب رانا جنگ بہادر صاحب، جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، جناب سی، کے نائر صاحب، جناب عبدالرحمٰن صاحب اور دیگر طلبائے قدیم نے سمپوزیم میں حصہ لیا۔ رانا جنگ بہادر صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ جامعہ کو اپنے دور اول میں بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی، مگر دوسرے دور میں چونکہ ملک کی قیادت یکسر ناکام رہی اور وطن تقسیم ہو گیا، اس لیے جامعہ کو اپنے مشن میں وہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی جس کی اس سے توقع تھی۔ موجودہ دور میں جامعہ کے رول کے سلسلے میں موصوف نے فرمایا کہ طلبہ میں ملک کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا جائے، ہندوستان کی تاریخ کو پھر سے لکھنے کی ضرورت ہے، تاریخ بادشاہوں اور امیروں کے ارد گرد نہیں گھومتی، عوام کے ارد گرد گھومتی ہے، اس سلسلے میں بھی جامعہ کے لئے بہت وسیع میدان ہے۔ نئے نظریوں اور نئے فلسفوں کو نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہیئے۔ ہیومینیٹیز (Humanities) اور سائنسز کے تمام مضامین میں بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں، طالب علموں کو ان تبدیلیوں سے واقف کرانے کی ضرورت ہے۔ آخر میں انھوں نے فرمایا کہ ملک کو صحیح قومی لائن پر لانا ضروری ہے، مگر جامعہ ہو یا کوئی اور تعلیمی ادارہ، اس کو اس وقت تک کامیابی نہیں ہوسکتی، جب تک مرکزی تعلیم کی پالیسی اور ڈھانچے میں تبدیلی نہ ہو۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے فرمایا کہ جامعہ کے حالات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد۔ آزادی سے پہلے جامعہ نے قومیت کے میدان میں نمایاں اور ممتاز خدمت کی ہے، جسے آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ رانا جنگ بہادر صاحب کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری جامعہ پر نہیں ہے، اس کا ذمہ دار پورا ملک ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ آزادی کے بعد جامعہ قومی حکومت کے اہتمام میں آگئی ہے اور ایسا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ موجودہ حالات میں میرا خیال ہے کہ یہاں کے گریجویٹ اسلام کی اس طرح خدمت کرسکتے ہیں کہ وہ قومی جھگڑے سے باہر نہ ہو، جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو گیا ہے، اب جامعہ کو علم اور تحقیق کے میدان میں اپنا ممتاز مقام پیدا کرنا چاہیئے، مثلاً تاریخ کے میدان میں نئے طالب علموں کو کچھ ایسے کارنامے انجام دینے چاہئیں، جن سے جامعہ کی امتیازی اور انفرادی

شان نمایاں ہو سکے، مختلف مسائل پر معروضی طور پر غور کیا جائے اور غیر جانبداری کے ساتھ ان کا حل تلاش کیا جائے، جامعہ کا اصول بہت بلند رہا ہے، اس معیار کو قائم رکھنا چاہیے، جامعہ کے اسکولوں کو بڑی شہرت حاصل رہی ہے، ان کی طرف جامعہ کی توجہ کو برابر قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔

جناب سی کے نائر صاحب نے فرمایا کہ جامعہ نے پہلے دور میں بہت شاندار رول ادا کیا ہے اور حکومت سے امداد لینے کے باوجود اس نے اپنی خصوصیات کو بڑی حد تک باقی رکھا ہے، یہ بڑی بات ہے۔ نیا ہندوستان بنانا ہے، ہندوستانی برادری کے قیام اور اس کے فروغ میں مدد کرنی ہے۔ جامعہ کو پہلے دور میں بہترین استاد حاصل تھے، اب بھی بہت سے ایسے استاد ہیں جن پر ہم فخر کرسکتے ہیں، ان کی تعلیم و تربیت میں ایسے طلبہ یقیناً تیار ہوں گے جو ملک کی بہترین خدمت کرسکتے ہیں، قومی تعلیم کے پھیلانے میں جامعہ نے جو خدمت کی ہے، اس کی تعریف اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ یہ میری ہے، بلکہ اس نے واقعی شاندار خدمت کی ہے۔ ۳۲ء میں جامعہ میں میں آیا تو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم موجود تھے اور ۲۶ء میں تعلیم ختم ہوئی تو وہ شیخ الجامعہ تھے، ان سے جو انسپریشن ملا اور اب بھی جو مل رہا ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

جناب عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ جامعہ نے مجھ میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ کسی کام میں عار نہیں سمجھنا چاہیے، سب سے بڑی چیز جو جامعہ نے دی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو غلط ہو اس کو ترک کیا جائے اور اس کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ اس سے عملی زندگی میں مشکلات بھی پیدا ہوئیں اور ان سے مدد بھی ملی۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، بنیادی طور پر ہمارے سامنے سماجی مسائل ہیں، ان میں ہماری روش، ظاہر ہے سب سے مختلف ہونی چاہیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کو انسانی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ آزادی کے بعد نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، جامعہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کے حل میں مدد کرے گی۔ آج کے دور میں کوئی ملک اور کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بہت آگے نہ ہو، جامعہ کو چاہیے کہ اپنے نصاب میں ان کو وہ جگہ دے جو ترقی یافتہ ملکوں میں دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے موضوع بحث میں حصہ لینے کے بجائے اُس جامعہ کے حالات اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی، جو کراچی شہر کے مضافات میں ملیر کے مقام پر جامعہ ملیہ کے طرز اور اصول پر قائم کی گئی ہے۔ اس کے قیام اور چلانے میں ان لوگوں کا حصہ ہے، جو جامعہ ملیہ میں کام کر چکے ہیں یا پڑھ چکے ہیں۔

مقررین کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے سہ پہر میں اس سمپوزیم کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں زیادہ تر ان طلبائے قدیم نے حصہ لیا جو نسبتاً نئے ہیں۔ ان لوگوں نے زیادہ تر انجمن طلبائے قدیم کو بہتر اور مضبوط بنانے اور اس کی تنظیم کو زیادہ وسیع کرنے پر زور دیا۔

جلسۂ یوم تاسیس در اصل جوبلی کا خاص جلسہ تھا، جس کی خصوصی مہمان وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی تھیں اور جس کی صدارت دہلی کے لفٹنٹ گورنر جناب اے این جھا نے کی۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جو تقریر کی، اسے ہم جامعہ کے پچھلے شمارے میں شائع کر چکے ہیں، اس لئے اس کے اقتباسات دینے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر کے بعد محترمہ وزیر اعظم نے ایک مختصر تقریر کی، جامعہ کے جشن میں شرکت پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور جامعہ کی خدمات کا اعتراف کیا اور اس کی سراہنا کی۔ انھوں نے فرمایا کہ

> ہم لوگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی یادگار میں ایک سادہ مگر خوبصورت مزار بنوانا اور ایک اسلامی مرکز قائم کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کی اصل یادگار جامعہ ملیہ ہے اور یہ ہری بھری اور زندہ رہے گی اس وقت جب وہ اپنے لئے نئے راستے ڈھونڈے۔ پروفیسر صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ترقی کی راہ میں اطمینان ہی سب سے بڑا خطرہ ہے، ہمیں اپنے کاموں پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہئے اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ کبھی کبھی ہم خود اپنی راہ میں ایسی رکاوٹیں کھڑی کر لیتے ہیں کہ صحیح راستہ اور صحیح رائے جاتی رہتی ہے، یہی حال سب جگہ ہے۔ ابھی میں امریکا سے لوٹی ہوں، وہاں کس طرح نیا زمانہ آرہا ہے، آپ اس سے ناواقف نہیں ہوں گے، ہر جگہ بے چینی ہے، بے اطمینانی ہے، پرانے طور طریقے ختم ہو رہے

ہیں، نئے طریقے آرہے ہیں۔ ہمارے ملک اور ہماری تعلیم کو اسی وقت ترقی ملے گی جب آپ نئے نئے راستے ڈھونڈ یں گے، ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ایسی ٹریننگ دیں گے کہ وہ ہمیشہ طالب علم بنے رہیں اور ہمیشہ سیکھتے رہیں۔ اداروں کو جب بڑی امداد ملی ہے اور پیسوں کی طرف سے اطمینان ہوا ہے تو اس سے فائدہ بھی ہوا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ کہ کام آگے بڑھا، سیوا کا میدان وسیع ہوا، نقصان یہ کہ کام کرنے والوں میں اطمینان پیدا ہو گیا اور نئی ذمہ داریاں اٹھانے کی ان میں سکت باقی نہیں رہی۔ ہمارے دیش میں بڑے بڑے لوگ اسی دور میں پیدا ہوئے ہیں جو سب سے زیادہ مشکل اور پریشانی کا دور تھا۔ ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقوں کو اختیار کیا، اپنے بزرگوں کی عزت اور احترام کو باقی رکھتے ہوئے ان کے راستے کو چھوڑ کر نئے راستے کو تلاش کیا۔ جامعہ کو اس لیے کامیابی ہوئی کہ وہ تعلیم کے پرانے طریقوں اور نظریوں پر مطمئن نہیں ہوئی اور آئندہ بھی یہ اسی وقت ترقی کرے گی اور کامیاب ہوگی جب اپنی موجودہ ترقی پر قانع ہو کر بیٹھ نہیں رہے گی بلکہ نئی کھوج میں لگی رہے گی۔ اس کے ساتھ اس کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اپنا بار خود ہی اٹھانا ہے، باہر کی مدد کافی نہیں ہے اگر خود اپنی آپ مدد نہ کی جائے۔

امسال کانووکیشن کے موقع پر خطبہ پڑھنے کے لیے صدر جمہوریہ عالی جناب وی وی گری سے درخواست کی گئی تھی، جسے موصوف نے ازراہ کرم منظور فرمایا اور تشریف لائے۔ موصوف کو خطاب کرتے ہوئے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا:

ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس کانووکیشن میں، جس کا اجلاس جامعہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ہو رہا ہے تشریف لا کر جامعہ کے طالب علموں اور استادوں کو خطاب کرنا منظور فرمایا ہے۔ ہمیں خاص خوشی اس وجہ سے بھی ہے کہ آپ کا ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے بہت قریبی تعلق تھا اور اسی کی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ جامعہ کو آپ کی رہنمائی اور خاص سرپرستی حاصل رہے گی۔ جامعہ والوں کو اپنی طرف سے چاہیے کہ آپ کو اپنے حالات اور اپنی

کارگزاری سے باخبر رکھیں۔ اس وقت میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ کانووکیشن کے عام دستور کو چھوڑ کر، جس کے مطابق مجھے گذشتہ سال کی رپورٹ سنانا چاہیے، آپ کی خدمت میں پچھلے پچاس سال کے کاموں کا مختصر سا خاکہ پیش کروں۔

لیکن کاموں کا ذکر کرنے سے پہلے اجازت دیجیے کہ کام کرنے والوں کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ ایک برادری کی طرح رہیں، مگر ہم نے برابر اپنے اوپر یہ الزام لگایا ہے کہ ہماری جماعت میں وہ ہم آہنگی اور یک جہتی نہیں ہے جو کسی برادری میں ہونی چاہیے۔ ہم میں جو دیندار مسلمان تھے وہ کہتے کہ ہم اچھے مسلمان نہیں ہیں، جو نیشنلسٹ تھے وہ کہتے کہ ہم میں قومی جوش کی کمی ہے، جن لوگوں کو مسلمانوں کے فائدے نقصان کا بہت خیال تھا۔ وہ کہتے کہ ہم قوم پرستی کے جوش میں مسلمانوں کو ان کا حق دلانے کی تدبیریں نہیں کرتے، جو لیفٹسٹ تھے وہ باقی سب کو قدامت پرست اور اس وجہ سے نالائق سمجھتے۔ اعتراض اتنے تھے کہ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ کون کس پر کس نیت سے اعتراض کر رہا ہے، بس ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ ہماری جماعت کے لئے آپ اپنی تعریف کرنا ناممکن ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہماری تعریف کرتے تو خاموشی سے سن لیتے تھے۔ شاید ہماری بھلائی اسی میں تھی، کہ ایسی فضا میں ہر ایک کو رائے رکھنے اور رائے دینے کی آزادی ہو جاتی ہے اور خود جماعت یا جماعت میں کوئی شخص سب کو اپنے خیال یا اپنے اصول کا پابند نہیں کر سکتا پھر اگر ایک طرف وہ لوگ تھے جن کے نزدیک جامعہ کا سدھرنا اور ترقی کرنا ناممکن تھا تو دوسری طرف وہ تھے جو خیال اور عمل کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر اپنی ساری محنت جامعہ کے کسی تعمیری کام میں لگا دیتے اور ان کی وجہ سے جامعہ برابر ترقی کرتی رہی۔ ۶۲ء کے بعد سے جب تنخواہیں بڑھیں تو بہت سے لوگوں کو اندیشہ تھا کہ جامعہ اور اُن اداروں میں جہاں لوگ صرف تنخواہوں کے لئے کام کرتے ہیں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اور یہ اندیشہ اس طرح سے بیان کیا گیا کہ ہم ایک بڑے خطرے سے بچ گئے۔ اب بھی اگر حکومت اور یو جی سی بار بار تنخواہیں نہ بڑھائیں یا بڑھائیں تو سب کی ایک ساتھ بڑھائیں تو

ہمارے یہاں تنخواہوں کی کمی بیشی کی بحث نہ ہوا کرے۔ ہم میں سے بہت کم کہیں گے یا خوشی سے کہیں گے کہ جامعہ میں کام کا معیار بہتر ہو گیا ہے، مگر جب کام پڑتا ہے تو اس میں اس طرح لگ بھی جاتے ہیں کہ پھر کسی بات کا خیال نہیں رہتا۔

ہم اپنے آپ سے برابر پوچھتے رہے ہیں کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے، اور کبھی کسی جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ کچھ یہ بھی خیال تھا کہ ایسے سوالوں کا جواب دیا ہی نہیں جا سکتا، جیسے کوئی شخص اس سوال کا معقول جواب نہیں دے سکتا کہ وہ کس لئے پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رائے تھی کہ ہمیں مقصد کی بحث میں نہ پڑنا چاہئے، ہم نے اپنے لئے ایک کام پسند کیا ہے، کام بہرحال اچھا ہے، چاہے جتنا محدود ہو، ہمیں اسے بہتر سے بہتر کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ پھر کیا ہوتا ہے۔ قومی زندگی کی تعمیر، قوم میں رواداری، بھائی چارہ، یک جہتی پیدا کرنا تعلیم کے کام ہیں، اور ہم انھیں خلوص اور استقلال کے ساتھ کرتے رہے تو اس سے ضرور مفید نتیجے نکلیں گے۔

یہ سب سمجھدار لوگ مانتے ہیں کہ تعلیم کی جان دینی اور اخلاقی قدریں ہیں، اور تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آدمی کو ان کی خدمت کرنے کے لائق بنائے، چاہے اس کا پیشہ تعلیم ہو یا تجارت، ملازمت ہو یا فنکاری۔ جامعہ اس بناء پر قائم کی گئی کہ مہاتما گاندھی اور بہت سے مسلمان لیڈر یہ محسوس کرتے تھے کہ سرکاری سکول، کالج اور یونیورسٹیاں نوجوانوں کو اخلاقی قدروں سے بیگانہ کر دیتی ہیں، جامعہ میں ہر طالب علم کے لئے اس کے اپنے مذہب کی تعلیم لازمی رکھی گئی، اور تعلیم کا مقصد یہ ٹھہرایا گیا کہ نوجوانوں کو ایک آزاد جمہوری ملک کے خوددار، حق پرست شہری بنایا جائے۔ گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کی جو تعلیم دیتے تھے وہ ہمارے لئے ایک بنیادی اصول بن گئی اور اس اتحاد کے خلاف جو تحریکیں تھیں ان کا مقابلہ کرتے کرتے ہم اپنے اصولوں میں اور پختہ ہو گئے۔ اب وہی رواداری اور انسان دوستی جسے ہم ملک کے اندر کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔ جامعہ میں حتی الامکان برتنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم دوسری تعلیم گاہوں کی طرح غیر جانبداری ثابت کرنے کے لئے دینی، اخلاقی اور تہذیبی روایات کو نظر انداز نہیں کرتے، بلکہ انہیں کو ہدایت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اور انھیں کی مدد سے ان جذبات کو فروغ دیتے ہیں جو ملک میں اتحاد اور ہم آہنگی قائم رکھنے کا اصل سہارا ہیں۔

تقریر کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا:

تعلیم اور تربیت کا کام بہت صبر آزما ہوتا ہے اور آج کل حالات نے اسے اور بھی مشکل بنا دیا

ہے۔ ہمارا قومی حوصلہ یہ ہے کہ پانچ سو کروڑ آدمیوں کو جمہوریت اور اشتراکِ عمل کے آداب سکھائیں۔ جب تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو چار کے درمیان بھی پورا تعاون آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ سیاست کا کوئی مسئلہ طاقت آزمائی اور جبر کے ذریعے طے کریں اور اس سے ہمیں اشتراکِ عمل کی ان چند مثالوں کی قدر بہت بڑھ جاتی ہے جو اِدھر اُدھر ملتی ہیں، جامعہ نے اور کچھ نہ کیا ہو تب بھی صبر اور استقلال کی مثال ضرور قائم کی ہے، اور اپنے آپ کو بہت کچھ ان تعلیمی اور تہذیبی دباؤں سے محفوظ رکھا ہے جو ملک میں پھیلتی نظر آرہی ہیں۔ اب ہمارے اوپر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کی انسانی خوبیوں کی یاد کو تازہ رکھنے کی ذمہ داری اور آگئی ہے اور میں آپ کو جامعہ والوں کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے خیالات اور اپنے عمل کے ذریعے ان کی یاد تازہ رکھنے کی پوری کوشش کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد عالی جناب وی وی گری نے اپنا خطبہ پڑھا اور سب سے پہلے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:

"میں اپنے آپ کو یہاں اجنبی نہیں سمجھتا، اس لیے کہ میرے معزز اور نامور پیش رو اور عزیز دوست ڈاکٹر ذاکر حسین کا اس سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ذاکر صاحب کے لیے جامعہ ایک طرح کی تجربہ گاہ تھی، لیکن ایسی تجربہ گاہ جہاں انھوں نے کام کیا، کام کا لطف اٹھایا اور جہاں انھیں وہ فرصت بھی میسر آئی جو اُن کے لئے انسپریشن اور تخلیقی و تعمیری کاموں کا وسیلہ بن گئی۔ جامعہ کے ذکر کے ساتھ ذاکر صاحب کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان کی متانت، ان کی دل آویزی اور ان کی انتہائی انکساری ایسی خصوصیات ہیں جو ایک تعلیم یافتہ آدمی کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں، ان کی صحبت میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک شریف آدمی کا ساتھ نصیب ہوا ہے۔

آخر میں انھوں نے جامعہ ملیہ کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"جامعہ ملیہ ایسے لوگوں کی شاندار قابلِ تقلید مثال ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں تعلیمی خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں۔ جامعہ کے بانی اور معمار ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسا شاندار ادارہ قائم کیا۔

سند پانے والے فارغ التحصیل طلبا کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا:

"آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ جہاں بھی جائیں گے اور جو بھی کام کریں گے، آپ اپنی مادرِ علمی کے اعلیٰ آدرش پر عمل کریں گے۔"

(باقی آئندہ)

Regd. No. D - 768 December, 1976

The Monthly JAMIA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25